میں حبس بڑھ گیا تھا، ہوا چاروں طرف سے بند ہو گئی تھی، گھر کے اندر دم گھٹتا تھا، اور گھر سے باہر کی دنیا سے بھی گھبراہٹ ہونے لگ گئی تھی۔ ماں کو سارا سارا دن چولہے پر بیٹھے دیکھ کر تپش میرے پھیپھڑوں میں اترنے لگی تھی اور میں جھلسنے لگ گئی تھی۔ میں نہ پردے کے اِس طرف کی رہی نہ اُس طرف کی، بلکہ پردے کی طرح ہی درمیاں میں ہی کہیں جھولنے لگی ۔کئی سال ایسے ہی گذر گئے اور میں یونہی جھولتی رہی۔ اور اب ہوٹل کے اس کمرے میں، وہ جھولتا جسم، اس صوفے پر میرے ساتھ آ کر لیٹ کر باتیں کرنے لگ گیا ہے۔۔

اسی نے وہ دن یاد کروایا جب میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ایک سات ربڑی گیند تھا جس لڑکی کے ہاتھ میں ہوتا وہ باقی لڑکیوں کو مارنے بھاگتی اور جس کی کمر پر وہ گیند مار دیتی تو مار کھانے والی لڑکی ہار جاتی۔ اس معصومانہ کھیل میں گیند سے مارے جانے کا درد بھی تھا اور ہارنے کا دکھ بھی۔ اور جس کو گیند لگتی اس کی درد کی چیخ میں ایک اضافی آواز شکست کی ہوتی۔ ہم سب چیختی چلاتی، ہنستی گاتی ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں، پھر یوں ہوا کہ ایک لڑکی کو نجانے کیا ہوا، آج میں اس کا نام بھی بھول رہی ہوں شائد نسرین ہو، یا زینب، کوئی بھی ہو مگر مجھے یہ یاد ہے کہ وہ میرے پیچھے بری طرح پڑ گئی تھی۔ میں کافی پھرتیلی تھی، اپنے دبلے پتلے، لمبے جسم کا خوب فائدہ اٹھاتی تھی، مگر اس دن اس لڑکی نے بھی ٹھان لی کہ مجھے ہی مار کر دم لے گی، سب کو چھوڑ کر وہ میرے پیچھے بھاگتی جا رہی تھی، میرے جسم میں سنسنی پھیل رہی تھی، اس کے ہاتھ میں پکڑے گیند کا خوف جو کبھی بھی میری کمر کو نشانہ بنا سکتا تھا مجھے بوکھلائے دے رہا تھا۔ میں اسی خوف اور بوکھلاہٹ میں چیختی ہوئی پردے کے دوسری طرف بھاگ گئی مگر گیند سے بچ نہ سکی اور وہ پوری قوت سے میری کمر سے ٹکرایا۔ میں درد اور شکست کے احساس سے زور سے چیخی، اور اسی لمحے ایک زناٹے دار تھپڑ سے میرا سارا جسم گونج اٹھا، گرتے گرتے میں نے ایک سائیکل سوار کو ایک لمحے کو رکتے

دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر اطمینان تھا اور وہ سائیکل کا پیڈل مارتا دور نکل گیا کیونکہ وہ پہچانتا تھا کہ لڑکی کو مارنے والا اس کا اپنا باپ ہی ہے۔ اسی لمحے ابا کی تیز آواز میرے گالوں کے ساتھ ساتھ کان پھاڑ گئی۔۔ تم پاگل کی بچی ہو؟ چیختی ہو؟ کیوں چیخ رہی تھی گلی میں کیوں چیختی نکلی اور پھر مجھے بالوں سے پکڑ کر گھر کے اندر دھکا دیا اور انگلی کھڑی کرتے ہوئے مجھ گری ہوئی کو پاؤں سے کمر میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا،

"جوان لڑکیاں چیختی نہیں ہیں، ان کی آواز بھی کسی غیر مرد کے کانوں میں نہیں جانی چاہیئے۔۔ کاٹ کے رکھ دوں گا"۔

اور غصے سے ان کے منہ سے تھوک اڑنے لگا تھا، ان کے اندر کمرے میں جاتے ہی میری سہیلیاں خوف سے اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئیں، ایک نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پوچھا "تم ٹھیک ہو؟ مگر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ بھی بھاگ گئی تھی اور اسی لمحے اماں کی آواز اندر سے آئی "لڑکی جوان ہو رہی ہے اسے اس کی سہیلیوں کے سامنے تو نہ مارتے ، بعد میں سمجھا دیتے۔۔"

ابا کا غصہ ابھی بھی آسمان سے باتیں کر رہا تھا:

"تم چپ کرو، اب کم از کم ساری عمر یہ تو یاد رکھے گی کہ لڑکیوں کی آواز گھر سے باہر نہیں نکلنی چاہیئے، یہ تھپڑ اسے یہ سبق بھولنے نہیں دے گا، بھلا عورتیں بھی ایسے چیختی ہیں؟؟"

اور اماں کی ہنڈیا میں چمچہ چلانے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔۔۔ اور ابا اپنا سبق دہراتے جا رہے تھے۔

"بھلا کبھی عورتیں بھی ایسے چیختی ہیں؟؟"

ابا نے ٹھیک کہا تھا مجھے یہ تھپڑ ساری عمر یاد رہے گا۔ اس واقعے میں مجھے تھپڑ ہی یاد رہا اس سہیلی کا نام بھی بھول گیا جو میرے پیچھے بھاگ رہی تھی، جس کی وجہ سے میں چیخی تھی

اور نہ چیخنے کا سبق بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اسے یاد رکھتی تو شائد آج ایک ایسی بیٹی ہوتی جو صابر ہے اور ماں باپ کی شناخت بن کر زندہ ہے اور ان کی تربیت ہی اس کی پہچان ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس سوال کا جواب کتنا آسان ہوتا۔۔

"میں ایک ایسی صابر بیٹی ہوں جس نے باپ کے تھپڑ کو یاد رکھا اور چیخنا بھول گئی، میں جذبات کو پینا جانتی ہوں، میں آواز کو دبانا جانتی ہوں، میں خوابوں کے محل کی باسی نہیں حقیقت کی کٹیا میں جیتی ہوں۔۔ مگر میرے پاس ایسا کوئی جواب نہیں ہے۔

"تو میں کون ہوں؟ میں وہ تھی جو چیختی تھی، میں وہ نہیں بن سکی جسے چیخنے سے روکا گیا تھا، میں پردے کے باہر کی دنیا میں نکل تو آئی مگر وہ تھپڑ بھی میرے ساتھ ساتھ بھاگتا گیا اور میں اس پردے کی طرح درمیان میں ہی جھولتی رہی۔

صوفے سے اڑتی گرد نے میرا پنڈورا باکس کھولا تو اس میں سے میری کہانیاں اور چیخیں نکلنے لگی ہیں۔ وہ جملہ بھی کمرے میں دائرے میں گھوم رہا ہے" لڑکیاں کبھی چیختی نہیں ہیں۔۔ ان کی تو آواز بھی غیر کے کان تک نہیں جانی چاہیئے"۔

میں اس اجنبی صوفے پر بیٹھی، اس کی بدرنگی کو دیکھ رہی ہوں۔ کتنے لوگ اس پر بیٹھتے ہونگے مگر اس پر کسی کا رنگ نہیں چڑھا۔۔ وہ اپنی بدرنگی میں مست ہے کیونکہ جانتا ہے کہ بیٹھنے والے صرف اپنی غرض کو آئے ہیں۔ اور اگر وہ نہیں بیٹھنے دے گا تو کہیں اور جا بیٹھیں گے وہ کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پیار سے اب صوفے پر لیٹ گئی ہوں اور صوفہ مجھ سے باتیں کرنے لگا ہے، اس نے میرے جسم کو سہلانا شروع کر دیا ہے۔ اس کی بدرنگی اور میری دونوں مل کر ایک عجب رنگ پیدا کر رہی ہیں اور اس کا اثر ہلکا ہلکا نیلا ہوتا جا رہا ہے۔۔ اس صوفے کی دنیا میرے ابا کی صحن کی دنیا سے بہت دور ہے، دنیا کے دوسرے کنارے پر۔

میں نے صوفے پر دوبارہ جمتی ہوئی گرد کو دیکھ کر اس چہرے کو یاد کیا جو میری زندگی میں رنگ لے کے آیا تھا۔ وہ مجھے ٹوٹ کے چاہتا تھا۔ اس کے پیار نے مجھے کھویا ہوا اعتماد واپس لوٹایا، میری گھبراہٹ کو اطمینان دیا اور میں مغرور ہوگئی۔ لوگ شور مچانے لگے:

"شادی کے بعد مرد بھول جاتے ہیں"۔

سہیلیوں کے اندیشے سرگوشیاں بن کر میرے کانوں میں اترنے لگے اور تجربہ کار محلے والیوں نے باآواز بلند اظہار شروع کر دیا" ابھی تو آگے پیچھے گھوم رہا ہے بعد میں بھول جائے گا۔"

ا"یسا ہر دفعہ نہیں ہوتا، ہر ایک کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میرا دل آئینے کی طرح صاف ہے مجھ سے کون برا کر سکتا ہے" میں پورے یقین سے کہتی۔" وہ تو اتنے سادہ دل کا ہے اس کے دل میں کھوٹ کیسے آئے گا"۔۔ میں مزید کہتی۔" اور مجھ سے اچھی اس کو اور ملے گی کہاں"۔۔ میں کہتی جاتی۔۔۔

پھر میں نے اپنی ذات اس میں گم کر دی۔ نگہت فاروق سے نگہت وقار ہوگئی۔ میں ان دنوں سوچتی تھی میں ماں باپ کی تو کبھی تھی ہی نہیں نہ وہ میرے تھے، میں تو سانس لینے کو کچھ پل ایک پناہ گاہ میں رکی ہوئی تھی، میری شناخت اور میرا گھر تو وقار ہے۔ ہم ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ میں ماننے لگی تھی کہ وہ میرے بغیر ادھورا ہے اور وہ میرے حال کی خبر رکھتا ہے۔ مگر آج اس اجنبی جگہ پر بیٹھ کر میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ وہ میرا گمان تھا۔ وہ زندگی کے بڑے مختصر پل تھے جب میں نے اپنے نام میں شناخت کی سیاہی بھری دیکھی تھی۔ ہم دونوں چلتے جا رہے تھے، ایک دم میں نے یونہی رک کر دیکھا تو جانا کے اس کے قدم تو کہیں اور پڑ رہے ہیں۔ میں دم لینے کو نہ رکتی تو شائد کبھی نہ جان پاتی۔ قدموں کا آپس میں کوئی تال میل نہیں بیٹھ رہا تھا۔ جس ہاتھ کو میں وقار کا ہاتھ سمجھے تھامے ہوئے تھی وہ تو میرا

اپنا ہی ہاتھ تھا۔۔اس کا ہاتھ تو نہ جانے کب سے میرے ہاتھ سے سرک چکا تھا، میں تو خود کو تھامے بیٹھی تھی۔میرے پاؤں بھی جن قدموں کو اس کے قدم سمجھ کر ان پر پڑ رہے تھے، وہ بھی اس کے قدموں کا سایہ تھے۔ہم دونوں کے قدم تو دو مختلف سمتوں میں اٹھ رہے تھے۔ میں گھبرا اٹھی۔رک کر دیکھنا ایک قیامت ہو گیا۔میں نے اس سے الجھنا شروع کر دیا۔میں نے اس خاموش، بے رخے، بے منزل سفر پر احتجاج کرنا شروع کر دیا۔میں نے اپنے اور اس کے ہاتھوں کو، قدموں کو پھر سے اکٹھا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔وہ دور دور رہ کر چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔سالوں کی عادت پک چکی تھی۔وہ اپنی زندگی میں مگن ایک خدا بن چکا تھا۔میری شراکت پر وہ بلبلا اٹھا۔میری مداخلت اسے بری لگنے لگی۔میرا چونکنا، دیکھنا، جاگنا اسے ہرگز پسند نہیں آ رہا تھا۔روز کے جھگڑے شروع ہو گئے۔گھر میں ٹھہری ہوئی خاموشی شور میں بدلنے لگی۔گھر کے کونوں میں دبکے خاموش بچے بھی اپنے اپنے کونے کھدروں سے نکلنے لگے۔ہمارے خاموش سفر کے خاموش ساتھی۔۔کیوں، کب، کیسے ۔۔کے شور میں شامل ہو گئے۔میں نے چونک کر انہیں بھی دیکھا۔میرے ارد گرد تنی چاکلیٹ کی دیواریں دھڑا دھڑ گرنے لگیں اور میں چاکلیٹ کے محل کی شہزادی دیواروں کے گرتے ہی، راستہ بنتے ہی، باہر کی دنیا میں چل کر جانے لگی، اور ننگی دھوپ میں ایکدم سے ننگی جا کر کھڑی ہو گئی اور ظلم پر ظلم یہ ہوا کہ اسی راستے سے باہر کی دنیا کے لوگ جن کے پیر، دل کیچڑ سے لتھڑے ہوئے تھے آنے جانے لگے۔

میں نے وقار سے پھر پوچھا۔۔کہاں ہو؟ خدا کے واسطے واپس آ جاؤ۔اس نے گمشدہ آواز میں کہا یہیں ہوں۔مجھے یقین نہ آیا، اس آواز کو بھی خود پر یقین نہیں تھا، اس نے یقین کو بحال کرنے کی بجائے اپنا سایہ بھی مجھ سے سمیٹ لیا۔مجھے اب سائے سے غرض بھی نہیں تھی میں حقیقت کی تلاش میں تھی۔اس کا سایہ تو اب بھی مجھ سے کہتا " تم میری جان

ہو"۔

مگر میں جان گئی تھی کہ یہ اس سائے پر سالہا سال پرانا ریکارڈڈ پیغام چل رہا ہے۔

> i am happy that u called, i am not available right now, but please leave your identity, i will get back to you as soon as i can.

میں بہت سالوں سے اسے میسیج چھوڑ رہی تھی اس امید کے ساتھ he will get back to me as soon he can مگر وہ مجھ تک پورے سچ سمیت نہیں آیا۔درمیان میں کہیں آ جاتا تو آج جاگنے کی نوبت نہ آتی، مجھ چاکلیٹ کی شہزادی کا محل یوں نہ ٹوٹتا، میری شناخت پر کیچڑ میں لتھڑے پاؤں نہ پڑتے۔اس کی بجائے چخ چخ بک بک ہونے لگی اور میں گھبرا کر چیخنے لگی۔۔ابا کی شناخت مجھ میں مکمل طور پر زندہ ہوتی تو شائد نہ چیختی مگر میں پوری طاقت سے چیخی۔وقار نے غصے سے مجھے دیوار میں مار دیا، گیند کی درد اور شکست کا دکھ دونوں میرے اندر ایک بھر پھر سے ہرے بھرے ہو گئے تھے۔مگر ابا کا سبق نہیں یاد آیا۔

میں اس دن کی طرح ہی خوف اور شکست سے زور سے چیخی اور اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر بیڈ پر گرا دیا اور مجھ سے بھی اونچی چیخا۔۔کیوں چیختی رہتی ہو؟ چیخنے کے علاوہ کوئی تمھیں کوئی اور کام نہیں، نکل جاؤ یہاں سے۔۔

وہیں مجھ میں ایکدم درد کی شدت کم ہو گئی اور ہارنے کا دکھ بڑھ گیا۔۔دکھ کی طاقت کے زیرِ اثر میں نے 911 کال کر دیا۔شکست کھائی ہوئی بلی چیتا بن گئی۔اور میں ابا کے صحن سے نکل کر ایک بار پھر پردے کے دوسری طرف، گلی میں کھڑی تھی۔میرے پاس اب صرف نگہت کا نام بچا تھا۔نگہت فاروق سے نگہت وقار تک کا سفر دھول اور مٹی سے بھرا ہوا تھا ،یقین اور بے یقینی کا راستہ کاٹ آئی تھی اور نگہت بن کر اپنے نام کے دوسرے حصے کو ہتھکڑی لگائے جاتا دیکھتی رہی تھی۔بچے رو رہے تھے، جو میرے بھی تھے اور اس کے بھی۔اس نے

مڑ کر مجھے زہر بھری نظروں سے دیکھا اور اس دن کی نفرت سالوں کی محبت کو کھا گئی، ہم کبھی دوبارہ اکٹھے نہ ہوسکے۔ بچے بھی ہماری زنجیر نہ بن سکے۔ نفرتیں سب محبتوں کو نگل گئیں۔

میں نے اسے گھر سے نکال دیا جس نے مجھے نکالنے کی بات کی تھی۔ میں ابا کے صحن سے نکل آئی تھی۔ مگر اسے یہاں سے نکالنے کے بعد میں جیت کا جشن بھی نہ منا سکی کیونکہ ابا کے تھپڑ کا نشان ابھی بھی میرے گال پر تھا، سب ہونے کے بعد ابا کی آواز دور کہیں قبر سے آئی تھی" عورتوں کی چیخ گھر سے نہیں نکلنی چاہیئے"۔

میں ابا کے تھپڑ کو بھلا کر اس کا سبق دہراتی رہی مگر کچھ تسلی نہیں ہوئی اگر ابا مجھ سے چیخنے کی وجہ پوچھتے میرے جسم میں اٹھنے والے درد کو سمجھتے تو میں شائد آج نہ چیختی۔۔ ابا نہ سہی وقار ہی مجھ پر چیخنے سے پہلے میرے چیخنے کی وجہ پوچھ لیتا تو شائد آج آواز گھر سے باہر نہ جاتی۔۔۔

آج اس بدرنگ اجنبی صوفے پر صرف نگہت بیٹھی ہے، ہر رنگ سے آزاد، اپنی بدرنگی کو اس صوفے میں ضم کرنے کی کوشش میں اس صوفے سے چمٹی بیٹھی،" میں کون ہوں" کا جواب ڈھونڈ رہی ہے۔

صوفے کی گرد بظاہر غائب ہو چکی ہے کمرہ صاف دکھائی دے رہا ہے اور اب مجھے وہ چہرہ نظر آ رہا ہے جسے سب طلحہ اور صوفیہ کی ماما کہنے لگ گئے تھے۔ زندگی کی روٹین بدل چکی تھی، صبح ہوتی، بچوں کے ناشتے بناتی، طلحہ کو فرائی انڈا پسند ہے، صوفیہ کو آملیٹ؛ لنچ بھی ان کی پسند کے ہیں، ان کے سکول کے کپڑے ان کے بیڈز پر رکھ کر، تولئے باتھ رومز میں پکڑاتی، اور تیار کر کے سکول بھیج کر جاب پر چلی جاتی تھی۔

کینیڈا میں بسنے والی لاکھوں سنگل مدرز کی طرح ایک اور سنگل مدر۔ وقار اس رات کی ذلت کو بھول نہیں رہا تھا، وہ سب چھوڑ چھاڑ پاکستان واپس چلا گیا تھا۔ اس دن کی ذلت

کے احساس نے اس کے اندر سے بچوں کی محبت بھی مٹا دی تھی۔ اس کی غیرت بڑی تھی، ہم سب چھوٹے چھوٹے بونے سے رہ گئے تھے اور وہ ہم بونوں کو چھوڑ کر پاکستان کے اٹھے ہوئے سروں والے مردوں کے گروہ میں جا شامل ہوا۔ پھر ایک دن اس کی شادی کی خبر ملی تو لگا دل سے ایک بوجھ کم ہو گیا ہو اور راستے زیادہ واضح ہو گئے ہوں۔ اسے اپنی عزتِ نفس واپس لانا تھی اور مجھے یہاں بچے پالنے تھے۔

اس تنہا دوڑ میں میں تھک جاتی اور مجھ میں چڑچڑاہٹ اترتی گئی۔ میری ہنسی نہ اب میرے ہونٹوں پر تھی نہ ہاتھوں کے پوروں میں۔ میرا پورا وجود ہنسی سے خالی ہو گیا۔ میں کھوکھلے وجود کے ساتھ پانی کے اوپر اوپر تیرتی رہی۔ پانی کے اندر کیا کیا گُل کھل رہے تھے مجھے اس کی خبر رکھنے کا بھی وقت نہیں تھا۔

بچے اب ہائی سکولز میں جانے لگے تھے۔ میں" طلحہ اور صوفیہ کی ماما" ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ان کی ضروریاتِ زندگی، جذباتی اتار چڑھاؤ، تربیت، سب کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ مجھے ان کی ہر بات کا دھیان رکھنا تھا۔

مگر اتنی بڑی دنیا میں میرا دھیان رکھنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ بچے بھی جب پاس آ کر بات کرتے تو ہمیشہ کچھ نہ کچھ فرمائش کرنے آتے تھے، میرا حال پوچھنے کا نہ انہیں خیال آتا تھا اور نہ اس کا ان کے پاس وقت تھا۔ مگر مجھے ایک ہی خیال تھا بس کہ یہ میرے جسم کے ٹکڑے ہیں اور میرے بغیر ان کا کوئی وجود نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں ان پر جی جان نثار کرنے لگی تھی۔۔ میرے لئے یہ احساس بڑا قیمتی تھا کہ کوئی تو ہے جو میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اماں ابا مجھے اتنی دور بھیج کر خوش و خرم رہتے رہے تھے وقار مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور دوسری شادی بھی کر لی ۔۔ مگر یہ بچے۔۔ یہ میرے جسم کے ٹکڑے، یہ، میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مگر آج اس اجنبی کمرے میں اپنے بچوں سے کوسوں دور بیٹھے میں یہ سوچ رہی ہوں وہ گمان کے لمحے بھی بڑے مختصر تھے۔ جیسے ہی وہ ہائی سکولز میں گئے، وہ میرے لئے سایہ بننے لگے، میں آنکھیں کھولے بیٹھی تھی، پوری طرح جاگی ہوئی تھی۔ اس لئے سایہ بننے کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بھی میرے بغیر رہ سکتے تھے۔ قدرت کا بنایا ایک نظام ہے، چاہے پاکستان ہو یا کینیڈا، آسٹریلیا ہو یا انڈیا، چین ہو یا افریقہ یہ ہر جگہ یکساں ہے، ایک دائرہ ہے جس میں بچے آگے آگے اور ماں پیچھے پیچھے بھاگتی رہتی ہے۔ ماں دم لینے کو رک سکتی ہے، آنکھ کھول کر دیکھ سکتی ہے مگر بچوں کی خواہشیں اور ضرورتیں اسے بھاگتے رہنے اور آنکھیں بند رکھے سفر مکمل کرنے پر مجبور رکھتی ہیں۔

میں سخت الجھن میں اور مصیبت میں تھی۔ ابا کا تھپڑ میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا اور محمود کے دھکے نے میرے جسم کے اندر آگ بھر رکھی تھی۔ کس کو دیکھتی؟ میرے بدن کی ضرورتیں تھیں۔۔ مگر ابا نے کہا تھا۔ عورت کی آواز چار دیواری سے باہر نہیں جانی چاہیئے۔ کینیڈا جیسے ملک نے مجھے 911 کی سہولت تو دے دی تھی مگر مجھے ابا کے تھپڑ کے خوف سے آزادی نہیں دلا سکا تھا۔۔ ورنہ میرا بستر محمود سے اتنی ذلت سہنے کے بعد سلوٹوں کے بغیر نہ رہتا، میرے اعضاء کی پکار میرے وجود سے نکل کر چار دیواری کے باہر تک ضرور جاتی۔ وقار کی دوسری شادی کے بعد بھی خود کو ایک وفادار عورت ثابت کرنے کے چکر میں نفسیاتی مریض نہ بن جاتی۔

کینیڈا کا قانون مجھے گاڑی، گھر تو دلوا گیا مگر میرے اندر تقسیم شدہ عورت کو نہ جوڑ سکا تھا۔ میرے اندر پھیلی گھٹن جو آج میری سب سے بڑی قاتل ہے اسے ہتھ کڑی لگا کر نہ لے جا سکا تھا۔ میں اب جس بلڈنگ میں رہ رہی تھی وہ پاکستانی خاندانوں سے بھری پڑی تھی۔ ملک سے کوسوں دور آ کر بھی ابا کے پردے کے اندر کی دنیا ادھر آباد تھی۔ ابا کے تھپڑ کی

گونج جسے میں نے اپنی شناخت نہ سمجھا تھا یہاں میرے اندر بجنے لگی۔ طلحہ اور صوفیہ کی ماما ابا کے دروازے پر پڑے پردے کی طرح آگے پیچھے جھولنے لگی، گھٹن چڑ چڑاہٹ بن گئی اور میرے ہاتھوں کے پوروں سے آگ برسنے لگی۔

ایک دن میں نے طلحہ کی سی گریڈ سے بھری رپورٹ دیکھی تو خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اسے چیخ چیخ کر بتانے لگی، وہ باتیں جو بتانے والی تھیں اپنی قربانیاں، اپنی محرومیاں اور وہ باتیں جو جوان بیٹے کو نہیں بتا سکتی تھی، آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہنے لگیں، میرے جسم میں پھیلی سالوں کی حبس چیخوں کی صورت اختیار کر گئی۔۔

میں زور سے چیخی اور اسی لمحے میرے منہ پر ابا کا دیا تھپڑ اور جسم پر محمود کا دھکہ محسوس ہوا جب طلحہ مجھ سے بھی زیادہ زور سے چیخا why u yell all the time

کہیں دور سے ابا بھی چلائے عورتوں کی آواز نہیں نکلنی چاہیئے۔۔۔ محمود کی چنگھاڑ ہر وقت چیختی کیوں رہتی ہو؟ تمھیں کیا ہے؟

طلحہ غصے سے پاؤں پٹختا باہر نکل گیا۔۔

آج اس بدرنگ صوفے پر بیٹھی سوچ رہی ہوں اس پر بھی بہت لوگ بیٹھے اور چل دئے، اس کا رنگ تو سب نے اتارا مگر اس پر کوئی رنگ نہیں چھوڑا کیونکہ اس نے بدرنگ رہنا منظور کر لیا مگر کسی کا رنگ لینے سے انکار کر دیا۔ یہ ضد توڑ سکتا ہے، رنگ لے بھی سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کس کا؟ کوئی اس کا حال نہیں پوچھتا اور وہ چپکے سے میرے کان میں کہتا ہے کوئی مجھے بھی تو یہ احساس دلائے کہ میرے نہ ہونے سے کسی کو فرق پڑے گا؟

اور میرے علاوہ کون اس بدرنگ ضدی صوفے کی ضد سمجھ سکتا ہے؟؟؟؟؟؟؟؟

سبق!!

"پتہ نہیں کس پر چلا گیا ہے؟" بڑی تائی نے انتہائی غصے سے تایا کو گھورتے ہوئے کہا۔

غفور یہ سنتے ہی وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ اسے پتہ تھا کہ اب ایک نا ختم ہونے والا گالیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

مگر بھاگتے بھاگتے تایا کی ہمدردانہ آواز کانوں تک پڑ گئی: "ہائے ہائے بس بھی کیا کر، یتیم بچہ ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کی نشانی۔"

"معاف کرنا ایسی نشانی وہ دونوں ساتھ ہی لے جاتے تو اچھا تھا۔۔" تائی کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"ارے یار میری بھی زندگی ایک مذاق ہی ہے۔۔" غفور کو گھر سے فرار ہوتے ہی چار اپنے جیسے آوارہ گردوں کی منڈلی بیٹھی مل گئی تو جھٹ سے گھس کے ڈائیلاگ بولنے لگ گیا۔

"ہاہا۔۔ اسے دیکھ کر ساری منڈلی چوکس ہو گئی۔

"ارے غفورے تو نہ ہو تو محفل سجتی نہیں۔۔۔" ایک منچلے نے اٹھ کر بازو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔۔

"بیٹھ جا بیٹھ جا۔۔ محفل سجا بھی لیتے ہو کم بختو اور پھر منہ دیکھے کی چاپلوسی۔۔" غفور

نے مصنوعی غصے سے اسی لڑکے کا بازو مروڑا۔۔

"آج کی کہانی سُنا استاد۔۔ آج کا اخلاقی سبق کیا ہے۔۔" ایک پتلے سے لڑکے نے بھاری سی آواز سے پوچھا۔۔

"ارے تجھے مفت کا اخلاقی سبق دیتا ہوں۔۔ بھاگ یہاں سے۔۔ الو کا پٹھا۔۔" غفور نے اسی لڑکے کی طرف کر کے ہوا میں ٹانگ چلائی۔ وہ لڑکا ہوائی ٹانگ کے خوف سے ہی زمین پر گر گیا۔

"ہاہا۔۔ منچلوں کے قہقہوں کا ایک طوفان گلی میں آ گیا۔۔

"توبہ ہے ان مشٹنڈوں کو کوئی اور کام نہیں۔۔ ماں باپ نے بھی پیدا کر کے کتے کے پلوں کی طرح گلیوں میں چھوڑ رکھے ہیں۔۔" پاس سے گذرتی ایک بوڑھی عورت نے رُک کر انہیں بے نقط کی سنا ڈالی۔۔

"ارے ارے اماں مان نہ مان میں تیرا مہمان۔۔ تجھے کس نے دعوت دی اتنے اعلی پائے کے سیمنار میں مفت کا خطاب کر جائے۔" غفور کی بہادری کا کون قائل نہیں تھا۔۔

"ارے جا دفعہ ہو تیرے کون منہ لگے۔ زندگی میں منہ کی کھائے گا۔۔ حرام خور۔۔" بڈھی عورت بے بسی سے چلائی۔۔

"ارے جا اماں تو بڑی تخت پر راج کر رہی ہے، خاوند بھری جوانی میں تجھے چھوڑ گیا اب تو اپنی خوشیوں کا انتقام ہم معصوموں سے لیتی ہے"۔۔ اسکے ساتھ ہی سب نے معصوم سی صورتیں بنا لیں۔۔

"ٹھہر جا تو غفورے تیرے تایا کو بتاتی ہوں تیرے کرتوت، بڑی گندی فطرت ہے تیری، ابکائی آتی ہے تیرا چہرہ دیکھ کے۔۔ منحوس مارا" عورت یہ کہتے ہی مزید بے عزتی سے

بچنے کے لئے تیزی سے گلی کا موڑ مڑ گئی۔

"نہ شرم نہ حیا۔۔" بڑھیا منہ میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔۔سامنے والی دکان سے حافظ صاحب بولے،

"صدیقہ تو کیوں منہ لگتی ان بدتمیزوں کے۔چھی چھی۔۔بہت ہی غلیظ لڑکا ہے یہ غفورا۔۔"

غفورے نے فخر سے مڑ کر اپنی منڈلی کو دیکھا۔" دیکھا!! اپنی طاقت، سب کی توجہ کا مرکز ہوں میں۔۔میں عبدالغفور المشہور غفورا۔۔"

اورسب زور زور سے تالیاں بجانے لگ گئے۔۔

'چلو اسی خوشی میں مُنے تجھے اخلاقی کہانی بھی سنا دیتا ہوں۔۔کچھ دن پہلے سکول سے ایک دوست کا لنچ پورے کا پورا چُرا لایا تھا، سالا مرغِ مسلم لاتا ہے سکول لنچ میں۔۔باپ کی حرام کی کمائی، تو میں نے کیا بُرا کیا۔۔اڑا لایا۔۔اب گھر بیٹھا مزے لے لے کے کھا رہا تھا کہ جان کی دشمن تائی نے گردن سے دبوچ لیا۔۔اور پوچھنے لگی کہاں سے آیا۔ میں نے زور لگا کے گردن چھڑائی اور کہا بہت بھوکا ہوں پہلے کھا تو لینے دے۔۔ پتہ ہے آگے سے کیا کہتی ظالم تائی، کہتی کھا! مر! مگر یاد رکھ حرام کا مال ہضم نہیں ہوتا، الٹی آئے گی تجھے۔۔"

"یارو میں نے کھا تو لیا، مگر سارا دن الٹی کے انتظار میں خوفزدہ بیٹھا رہا، اسی لئے تین دن سے تم لوگوں کے پاس نہیں آیا۔۔پورے تین دن اپن نے اس الٹی کا انتظار کیا جو تائی کے مطابق چوری کا حرام مرغ کھانے سے آنی تھی۔۔"

"آئی پھر؟۔۔منے نے جلدی سے ڈر کر پوچھا۔۔

"ارے سالے تو تو ایسے شرما کے پوچھ رہا ہے جیسے معشوقہ آئی کہ نہیں۔۔۔منے

پورے تین دن کا چلہ کاٹا، تم لوگوں کو منہ نہیں دکھایا۔۔کوئی کچا اخلاقی سبق نہیں دینا چاہتا تھا۔۔نہ الٹی آئی نہ گئی۔۔تم لوگوں کا بھائی ہٹا کٹا۔۔تو میرے چیلو فضول بات ہے، بکواس ہے یہ کہ چوری کر کے مرغ کھاؤ گے تو الٹی آ جائے گی۔۔ایسا کچھ بھی نہیں۔۔بس باتیں بنی ہوئی ہیں۔"

غفورے کی بات ختم ہوتے ہی زندہ باد کے نعروں سے گلی گونج اٹھی، تو شبیرا چاچا غرایا" خدا کا خوف کرو مشٹنڈو"۔۔

آدھی رات کے بعد گھر میں گھس کر تائی کی نظروں سے چھپ کر بستر تک پہنچنا روز کا ایک کٹھن کام تھا۔ایک دفعہ سو جاؤ تو پھر وہ جلاد تائی کچھ نہ کہتی تھی۔۔ پتہ نہیں غفورے کی کھلی آنکھوں اور چلتے قدموں سے اسے نفرت تھی۔۔ ہر وقت آسمان سر پر اٹھائے رکھتی۔۔

تایا کا گھر پوری ایک مسجد تھا، جس کے اوپر لگتا خانہ کعبہ کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ہر وقت دربار جیسی خوشبو آتی رہتی۔قران کی تلاوت ہوتی رہتی، عورتوں کے میلاد اور وعظ چلتے رہتے۔اتنے پاکیزہ ماحول میں ایک غفور جیسا یتیم غلاظت کے چھینٹے اڑاتا پھرتا تھا۔اسی لئے تائی کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔اس کا بس نہ چلتا اس یتیم کو دور کہیں کسی گندے نالے میں غرق کر آئے۔

"قران میں یتیموں کے بڑے حقوق ہیں اللہ لوکے۔۔" تایا غفورے کو بچانے کے لئے قران کا سہارا لیتا۔۔

مگر تائی شائد اس حصے کو نکال کر باقی کے قران پر ایمان رکھتی تھی اس لئے اس کی نفرت میں کوئی کمی نہ آتی۔

غفور کے گرد اتنی نفرت تھی کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ غلاظت کیا ہے اور پاکیزگی کیا ہے؟ زمانے سے ہٹ کر کام کرنا، کوسنے لینا اور گالیاں سننا، اسی میں وہ مزے لینے لگ گیا

تھا۔ وہ سوچتا لگے بندھے نظام نے خوشی کو کھالیا ہے۔ یہاں کوئی خوش ہونا چاہے تو پابندیاں ماردیتی ہیں۔ لوگ کولہو کے بیل کی طرح دنیا دکھاوے کے لئے ایک خدا کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ مگر اپنے اپنے اصلی خدا الماریوں میں بند رکھتے ہیں۔ سب کاموں میں حرام حلال کا چکر ڈال کر دنیا کی خوشیوں کو بے مزہ کرتے ہیں۔ غفورا سوچتا جتنا مزہ اس چوری کی مرغی میں تھا کیا اتنا اسے گھر میں جوتوں کے ساتھ ملنے والی دال روٹی میں کبھی آیا تھا؟

منڈلی کے لڑکوں کے قد کاٹھ نکل آئے مگر حرکتیں وہی رہیں۔ اب اتنا فرق ضرور پڑ گیا تھا کہ شام کو منڈلی سکول کے بعد نہیں بلکہ کام کاج کے بعد جمتی تھی۔۔ شبیر چاچا بھی بڈھا ہو گیا تھا اب اس کا لڑکا کھوکھا سنبھالتا تھا اور بچپن کا بیلی ہونے کی وجہ سے ان کی خوب خاطر مدارت کرتا تھا۔۔ یعنی زندگی کے حالات بدل رہے تھے۔ گھر میں کوسنے دینے والی تائی مر گئی تھی اور کھوکھے کا گالیاں دینے والا چاچا بوڑھا ہو گیا تھا۔۔

"زندگی سے اور کیا چاہیئے۔۔؟ غفورا قہقہہ مار کر پان کی پیک دیوار پر تھوکتے ہوئے نعرہ لگاتا۔۔

"اور کیا چاہیئے۔۔ او بلے بلے اور کیا چاہیئے۔" باقی ساری منڈلی بھی خوشی سے جھوم جھوم کے گائے جاتی۔۔

بھتہ لیتے ہوئے غفورے کے ہاتھ نہیں کانپتے تھے۔ فرسودہ معاشرے کی کٹی پھٹی روایتیں، حرام اور حلال کی لکیر۔۔ وہ کسی کو نہیں مانتا تھا۔

"جو خوشی کی راہ میں آئے چاہے انسان ہو، یا اصول سالا گردن سے اڑا دو۔۔" غفور جوش سے یاروں کو یاد کرواتا رہتا.

اس کے اخلاقی سبق آج بھی پورے شوق سے سُنے جاتے تھے۔

"غفورے ناخن تو کاٹ لیا کر۔۔ کبھی کوئی لنگوٹیا کہہ اٹھتا۔۔

"ارے یہ تو بال نہیں کاٹتا۔۔" کوئی دوسرا آواز لگاتا۔

"جس دن نہالے گا اس دن باقی کے کام بھی کر لے گا۔۔ تیسری آواز پر غفورا چلا اٹھتا:

" کم بختو سالو۔۔ تم نے اپنی بہنوں کا رشتہ دینا ہے مجھے؟ حرامیو! زندگی ایک عیش کدہ ہے۔ طریقہ اور پابندی اس کی خوبصورتی میں داغ ہے۔ میری جان بہتے پانی کے آگے کوئی بند نہ باندھو۔۔ بس بہنے دو۔۔ عیش کرو۔ میری جان عیش۔۔۔"

اب بہت سے لڑکے تیل نکالنے والے امیر ملکوں میں کام کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ غفور وہیں کا وہیں تھا۔ کیونکہ اس نے اسی شہر میں تیل کا کنواں نکال لیا تھا۔ غنڈہ گردی اور بھتہ کا بے تاج بادشاہ۔ منڈلی چھوٹی رہ گئی تھی مگر غفور کا جذبہ اسی طرح کسی جن کی طرح بڑا سا۔

" اماں کیا لڑکی ہے۔۔۔۔ غفورے نے جس دن مہناز کو دیکھا اس کی رال ٹپکنا بند ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"یاروں نے سمجھایا ابے شریف گھر کی شریف اور خوبصورت بچی ہے تجھ جیسے موالی کو کون دے گا۔؟ تجھے تو کوئی کوٹھے والے نہ بیٹی دیں۔۔

"ارے کوٹھے والے تو دے دیں مگر صورت والی کون دے۔۔ اس کو تو کوئی بھنگن ہی ملے گی۔۔" ایک دل جلے نے گرہ لگائی۔۔

"ارے ایسی کی تیسی تم سب کی۔۔۔۔۔ آستین میں سانپ پال رہا ہوں۔۔ بھاگو یہاں سے کتورو"۔ غفورا پہلی دفعہ دوستوں کے مذاق پر ہنسا نہیں۔۔۔

پھر اس نے لڑکی کے گھر والوں کی اور رشتے کروانے والی کی زندگی جہنم بنا دی۔ لڑکی کے گھر والوں نے بدنامی کے خوف اور بیٹوں کی زندگی بخشوانے کو بیٹی کا ہاتھ اسے تھما

دیا۔۔ ہمیشہ کی طرح جیت اس کی ہوگئی اور پہلی رات دلہن کا گھونگٹ اٹھایا اور ساتھ ہی زور سے قہقہہ مارا۔۔

ایسے بھیانک قہقہے سے گڑیا جیسی دلہن سہم گئی۔۔

"تجھے پتہ ہے آج کا اخلاقی سبق کیا ہے؟ غفورے نے اس کی نرم و نازک کلائی بے دردی سے مروڑتے ہوئے کہا۔۔۔

وہ حیرت اور تکلیف سے اسے بس دیکھ کے ہی رہ گئی۔۔

"میری تائی کہا کرتی تھی بلکہ میری نمازی پرہیزگار اللہ کے کان میں گھسی رہنے والی تائی کہا کرتی تھی کہ "نیک آدمیوں کے لئے نیک عورتیں اور بد آدمیوں کے لئے بدکار عورتیں.. تو تُو آج مجھے بتا۔۔آج کے آج ہی فیصلہ کر لے۔کہ میں بھی تیری طرح نیک ہوں؟ یا تو بھی میری طرح بد ہے؟ آج کے آج ہی فیصلہ کر لے کل کو بک بک کی اجازت نہیں ہوگی۔۔آج ہی بتا دے۔۔۔"

اس نیک پری سے کوئی جواب نہ پا کے اگلے دن وہ منڈلی میں بیٹھا خطاب کر رہا تھا:

"دوستو! چوری کا کھا کے الٹی نہیں ہوئی تھی، پورے تین دن انتظار کیا تھا، بھتہ اور ناجائز قبضے کر کے میرا منہ سور کی طرح بھی نہیں ہوا اور سب سے مزے کی بات کہ بدفطرت دیو کو نیک سیرت پری مل گئی۔ہے کوئی پورے شہر میں میری بیوی جیسی کوئی حسین اور نیک بخت؟

منڈلی کے پرانے اور نئے ارکان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور پھر سب نے یوں اکٹھے سر ہلایا جیسے کسی بہت بڑی تجویز پر اتفاق رائے ہو گیا ہو۔۔

"غفورے بچے ہو گئے اب بس کر دے! ایک دن بیوی نے منت کی۔

"کیا بس کر دوں؟ تجھے پیار کرنا یا کاٹنا یا نوچنا؟۔۔۔ہی ہی غفورے نے پیلے پیلے دانتوں سے اس کے کندھے پر کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔

"بچوں کو حرام نہ کھلا۔۔بیوی نے لجاجت سے کہا۔۔

"حرام؟ شرم نہیں آتی محنت کی کمائی کو حرام کہتی ہے۔۔لعنت ہے تجھ جیسی کم عقل عورت پر۔۔"

غفورے کا اٹھا ہاتھ اور غصے سے کانپتے ہونٹ دیکھ کر بیوی ڈر کے کپڑوں کے بغیر ہی بستر سے چھلانگ مار کے کھڑی ہو گئی۔۔

"ناشکری عورت, اتنے صحت مند، لائق فائق بچے۔تیرے اندر اب کیا تائی کی روح آ گئی ہے؟ مر، دفعہ ہو جا، نظروں سے دور کر اپنا بڈھا جسم۔۔۔یہ شکر نہیں کرتی کہ ابھی تک اس کے پاس آ کر سوتا ہوں۔۔مگر ان کم ذاتوں کو عزت راس نہیں۔۔"

"بڑی کم بخت ہے میری بیوی۔۔اگلے دن حسبِ معمول منڈلی میں اعلانیہ انداز سے بولا۔۔

"کیا ہوا استاد؟ پرانے لنگوٹیوں کی جگہ اب اس کے شاگردوں نے لے لی تھی۔

"ہونا کیا ہے مجھے کہتی ہے اب کوئی محنت کا دھندہ کر اور بچوں کو حرام نہ کھلا۔حرام بچوں میں کہیں نہ کہیں نکل آتا ہے۔۔دو جوتے ماروں نہ اس ناشکری عورت کو۔۔۔۔"

غفورے کا غصہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔۔

"چھوڑ استاد کیوں غصہ کرتا ہے۔تیرے صحت مند لائق فائق بچے، ایک بچی کو تو بیاہ بھی چکا۔۔ایسا اچھا بر ملا۔۔تیرا تو ہر کام زبردست ہوتا ہے۔۔"

"تو اور کیا حلال کے چکر میں رہتا تو اب تک کسی فٹ پاتھ پر میری لاش کا بھی نام و نشان نہ ہوتا۔۔اور آج دیکھ میری نسل کیسے پھل پھول رہی ہے اور رہتی دنیا تک میرا نام

رہے گا۔"

"چھوڑ استاد یہ عورت ذات ہوتی ہی ناشکری ہے، سونے کے محل میں بٹھا کر سونے کا نوالہ بھی کھلائے گا نہ تو ٹر ٹر کرتی جائے گی۔۔"

"ہاں سالیاں مینڈک سے گڑتی لیتی ہیں، مگر تو دیکھنا اب یہ جو حلالی کام کیا ہے نہ نکاح، جس کا طعنہ مارتی ہے کہ اس کی وجہ سے بچے آباد اور شاد ہیں تو دیکھنا سالی کا یہ بھرم بھی توڑتا ہوں پھر تائی کی طرح منہ کالا ہوگا اس کا، وہ بھی حرام کی مرغی کھانے کے بعد میری الٹی کے انتظار میں ہی مرگئی۔۔سالی تائی کہیں کی۔۔۔۔۔"۔

"اس کے حلال نکاح کی ماں کی۔۔۔۔۔۔۔۔وہ صحن میں لیٹے لیٹے بھی یہی سوچ رہا تھا اور غصے سے ابھی بھی اسکا دماغ کھول رہا تھا ایسے میں اس کی نظر نئی کام والی پر پڑی۔۔

"ارے کیسا جوان، کسا ہوا بدن ہے اور سونے پر سہاگہ گونگی ہے۔۔اسے چھت پر جاتے دیکھتے ہوئے غفورے کے منہ میں حرام مرغی کا ذائقہ گھل گیا۔ نیچے والے کمرے سے بیٹی کی بیٹی کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ غفور کے آگے جوان جسم، کسی مزاحمت کے بغیر بچھا ہوا تھا اور اُسے یقینِ کامل ہے کہ حرام کھانے سے اُلٹی نہیں ہوتی۔۔۔گونگی کے کسے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے سوچا، سالا کل کی منڈلی میں بتانے کو ایک اور اخلاقی سبق تیار ہوگیا ہے۔۔سالی۔۔۔۔حلال کی بچی۔۔۔۔

برف

آج گھر سے نکلتے وقت اصغر کا دل کہہ رہا تھا کہ خوب بکری ہوگی اور بہت سے پیسے ملیں گے۔ اس خیال سے ہی اُسے خود بخود خوشی مل رہی تھی۔ یہ خیال ماں کی دعاؤں کے بعد اس کے ننھے سے دل میں پیدا ہوا تھا۔ آج اس نے جیسے ہی اپنے چائے پاپے ختم کئے تھے ماں نے دعاؤں کا لنگر ہی کھول دیا تھا، شائد آج ماں کو بڑے بھائی اکبر کی یاد ستا رہی تھی۔

اکبر بھائی جان اسے بھی بہت یاد آتے تھے۔ بہنوں کی شادیوں سے پہلے ماں کہا کرتی تھی کہ لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ ماپوں کے گھر میں مہمان، جیسے ہی ان کے اصلی گھر والے بیاہ کر لے جاتے ہیں، ان سے ہمارا کوئی ناطہ نہیں رہ جاتا، بابل کا آنگن بھول بھال جاتی ہیں۔ مگر اماں نے یہ بات بھائی جان کے بارے میں نہیں بتائی تھی، یا اماں کو خود بھی نہیں پتہ تھی، یہ شائد خالہ صغریٰ کو بھی نہیں پتہ، مجھے تو لگتا ہے یہ والی بات شہر میں کسی کو بھی نہیں پتہ کہ شادی کے بعد بھائی بھی اپنے گھر والوں کو بھول بھال جاتے ہیں۔ خالہ صغریٰ کو پتہ ہوتا تو وہ ہمیں ضرور بتاتی۔ وہ تو بس ہر وقت یہی بتاتی رہتی ہے کہ:

اماں جوان ہی تھی جب تمھارا ابا مر گیا اس کے مرتے ہی سب رشتے داروں نے بچوں کا بوجھ نہ اٹھانا پڑ جائے، آنکھیں پلٹ لی تھیں اور ان حالات میں اپنی عزت بچا کر کیسے ماں نے لوگوں کے گھروں میں کام کر کر کے ان چار نفوسوں کو پالا تھا. پھر بہنوں کی شادیاں کیسے کیں، ان کی لمبی داستان سنانا خالہ صغریٰ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اور اصغر اتنی بار یہ

کہانیاں سن چکا تھا کہ اب یہ حال تھا کہ خالہ بات شروع ہی کرتی تو اصغر طوطے کی طرح اسے سارا سبق سنا دیتا۔۔

" کم بخت ایسی ہشیاری مولوی صاحب کے سبق میں بھی دکھایا کر۔" ۔خالہ اس کی پیٹھ پر زور سے دھپہ مار کے کھسیانی سی ہو کے کہتی تھی۔

صبح گھر سے نکلتے وقت جو خوشی کا ایک ہلکا سا خمار اس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا، ان کہانیوں کو یاد کرتے کرتے اداسی میں بدلنے لگا۔ اب اس کے تصور میں ماں کا تھکا ہوا وجود چارپائی پر نڈھال پڑا تھا۔ ماں جب شام ڈھلے کام سے تھکی ہاری آتی تو اس میں بات کرنے یا سننے کی سکت بھی باقی نہ ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوٹھیوں والے اماں کی ہڈیوں کو نچوڑ کر اس میں سے گودا بھی نکال لیتے ہیں، بالکل جیسے چوہدری کے ہوٹل میں کبھی وہ دیہاڑی لگاتا تو اس موٹے بٹ کو دیکھتا تھا، جو مرغے کی ٹانگ سے گوشت تو نوچ نوچ کے کھاتا ہی تھا بعد میں دیر تک ہڈیوں کو چباتا اور چوستا رہتا تھا، ور پھر آخر کار انہیں فرش پر پھینکتا تو نیچے انتظار میں بیٹھا کتا لپک کر اس مسخ شدہ ہڈی کو منہ میں ڈالتے ہی مزید بے چین ہو جاتا تھا۔۔اصغر کی ماں جب اس کی بات کا جواب نہیں دیتی تھی تو اسے اپنی شکل اس کتے کی طرح لگنے لگ جاتی تھی، جو گودے سے بھری ہڈی کے انتظار میں مستقل طور پر بے چین رہتا ہے، ماں کبھی تو اسے پیار سے دیکھ کے گلے لگائے گی۔۔اور توجہ سے اس کی بات سن کر جواب دے گی، کسی ایک دن تو کوٹھیوں والے اس سے کم کام کروائیں گے۔

بے بسی اور غم کی لہر نے اس کے وجود کو جکڑ لیا، اور چلتے چلتے اس نے غصے میں راستے میں پڑے پتھر کو ٹھوکر ماردی نتیجے میں پتھر اڑ کر تھڑے پر بیٹھے فقیر کے پیالے میں جا گرا اور سارے سکے اچھل کر باہر آ گرے۔۔

اوئے نامراد، اگر میرے سر پر لگ جاتا تو۔۔فقیر نے اسی شدت سے پتھر اس کی

طرف اچھالا۔

اصغر نے پھرتی سے چھلانگ لگا کے اپنا سر جھکا لیا، اور فقیر کا نشانہ جو اصغر کا سر تھا، چُوک گیا، اس ناکامی پر فقیر اور زور زور سے گالیاں بکنے لگ گیا شور سن کر گلی کے کتے نے فقیر پر بھونکنا شروع کر دیا اور کتے کی آواز سن کر ایک کونے سے کالی بلی نکل کر اصغر کے سامنے سے تیزی سے خوفزدہ سی بھاگ کے گذر گئی۔۔

" اوہ تیری کی۔۔اب اور مصیبت، کالی بلی بھی راستہ کاٹ گئی"۔ ماں نے دس دفعہ اسے بتایا تھا کالی بلی راستہ کاٹے تو کوئی نہ کوئی آفت آتی ہے، اب وہ فقیر کی گالیوں کو بھول کر کالی بلی کے بارے غور کرنے لگ گیا۔۔

" لگتا آج الٹا حساب ہو گیا، پہلے آفت آئی پھر کالی بلی آئی"۔ اپنے اس خیال پر وہ خود ہی مسکرا اٹھا۔۔۔

" اوئے سور کے بچے کدھر بھاگا جاتا ہے، بڑے دانت نکل رہے ہیں تیرے کیا تیری جھگی میں سے کوئی خزانہ نکل آیا ہے، سالے ادھر آ"۔ ایک تیز اور بھدی آواز گلی کی شکستہ دیواروں کو ہلا گئی اور اصغر نے سہم کر آواز کی طرف دیکھا۔۔" اوہ تیری کی!" میں ایسے ہی کالی بلی کو گالی دے رہا تھا، اب میرا کیا ہو گا، اب تو راستے میں یہ گینڈا، کالا بلا آ کھڑا ہوا۔۔"

وہ اپنی نفرت کو کنٹرول کرتے ہوئے گھگھیایا۔۔جی جناب، میں تو، میں تو۔۔۔

" کیا میں تو، میں تو لگا رکھی ہے؟۔۔۔حرام خور، میں نے یہ جنرل سٹور تیرا اور تیری ماں کا پیٹ بھرنے کو کھولا ہے؟

بول مردود اب چپ نیچے کیا دیکھ رہا ہے؟ کیا سمجھتی ہے تیری ماں، بیوہ ہے تو لوگوں کا مال مفت کھائے گی اور ڈکار بھی نہیں مارے گی؟ تو یتیم ہے تو ہم اپنے بچوں کے منہ سے

نوالہ چھین کے تیرا ڈھول بھریں گے؟ ۔۔بشیر دکاندار نے اس کے پیٹ میں زور سے انگلی چبھوتے ہوئے کہا:

"ادھر دیکھ مر، بھرے بازار میں تیری شلوار اتار دوں گا، کیا تیرا حرامی اباپ مرتے ہوئے میرے نام کوئی جائیداد لگا گیا تھا، جس کی وجہ سے تم لوگوں نے میری دکان پر مفت لگا رکھا ہے؟"

"جی وہ میں آج ۔۔آج برف بکے گی تو ۔۔آج میں" احساس ذلت سے اس کے گلے میں ایک گولہ سا آ کر پھنس گیا تھا۔۔

دوکاندار نے زور سے اس کے منہ پر طمانچہ مارا" کیا میں میں لگا رکھی ہے ۔تیری "برف" کی ماں کی بھی ۔۔کہنا اپنی چنڈال ماں سے ادھار واپس کرے، یا اس کے کھسم نے آسمانوں سے آ کر ادھار تارنا ہے ۔۔حرام خورے ۔۔مفت خورے" ۔۔

اپنے مرے ہوئے باپ اور بیوہ ماں کو یوں گالیاں پڑتے دیکھ کر اس کی آنکھوں سے بے بسی کا سمندر امنڈ آیا ۔۔

"اب دیکھ کیسے رونی صورت بنائے کھڑا ہے، ادھار واپس نہیں کرنا اور گوشت کھانا ہے، تیری ماں کیا سمجھتی ہے میں پاگل ہوں، کل میری بیوی بتا رہی تھی کہ تیرے گھر گوشت بھوننے کی خوشبو آ رہی تھی، تیری پسلیوں سے تیرا گوشت الگ کر دوں گا، ماں کو بتا دینا جا کے ۔۔دفعہ ہو یہاں سے دانت نکالتا صبح صبح سامنے آ گیا ۔۔تم جیسے مفت خوروں اور ہڈحراموں کی تو دل کرتا ہڈیاں توڑ دوں ۔۔اب کس کی جان کو رو رہا ہے؟ دنیا کو یہ بتائے گا کہ میں ظالم ہوں اور تو یتیم ۔۔دفعہ ہو جا نظروں سے دور ۔۔دکاندار نے اسے زور سے دھکا دیا اور اصغر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، دس سال کا کمزور سا تو وجود تھا اس کا، دھڑام سے پاس بہتی گندی نالی میں گر گیا۔سکولوں کو جاتے ہوئے، صاف ستھرے یونیفارم پہنے بچوں

نے اسے یوں گرتے دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس پڑے، کم از کم آج کے دن سکول کی بور زندگی میں اس مزاحیہ منظر کی ہلچل رہے گی اب فقیر بھی پیلے پیلے دانت نکال کر ہنسنے لگا اور بشیر دکاندار نے سب کو ہنستے دیکھا تو فخر سے سر کندھوں سے اونچا اٹھا لیا جیسے صبح صبح یہ مفت کی تفریح لوگوں کو دے کر اس نے کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو مگر اپنے ڈوبے پیسے یاد کر کے پھر غصے سے چلا اٹھا "ہڈحرام" ۔۔اور اصغر کو دیکھے بغیر تیز تیز یوں اپنی دکان کی طرف بڑھنے لگا جیسے اس کی "کالی بلی" اصغر ہو۔

اصغر نے کھسیانی سی ہنسی سے بچوں کی طرف دیکھا، اپنے آپ کو سمیٹا، ہاتھ میں پکڑی خالی بالٹی کو مضبوطی سے تھاما، ماں نے جو برف خریدنے کے لئے پیسے دیئے تھے انہیں جیب کے اوپر سے ہی پکڑ کے محسوس کیا" کہیں گر تو نہیں گئے؟" ۔

نالی میں نچلا دھڑ گرنے کی وجہ سے اس کی شلوار، پائینچوں سے اوپر تک بھیگ گئی تھی ۔آگے جا کر اس نے پیسے نکال کے دیکھے، "شکر ہے پیسے گیلے ہونے سے بھی بچ گئے، اور اس موٹے سانڈ سے بھی" وہ بڑبڑایا ۔۔اب کہ اس نے مسکرانے کی جرأت نہ کی، "کیا پتہ پھر کوئی ہنستے دیکھ لے اور سر پر چپت لگا دے، پتہ نہیں اماں نے بھی کس کس سے ادھار لیا ہوتا ہے، کوئی بھی مانگنے والا اسے مسکراتے دیکھ کر دبوچ سکتا ہے" اس خیال کے آتے ہی اصغر نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے کہ کنارے سے بھی کوئی مسکراہٹ پھسل کر اس کے چہرے پر نہ پھیل جائے ۔۔۔۔"یا اللہ یا رسولؐ اصغر علی بے قصور ۔۔یا اللہ یا رسولؐ" ۔وہ آج کل کے مشہور نعرے کو اپنے نام کے ساتھ گنگنانے لگا اور اسی لمحے اسے وہ گوشت کی خوشبو جس کی وجہ سے اس سانڈ دکاندار نے اسے مارا تھا، تیزاب کی طرح آنتوں کو کاٹتی محسوس ہوئی۔

"آج ٹھنڈا پانی بیچنے سے بہت پیسے ملیں گے، وہ سب اس کالے بھالو کے منہ پر

مارُوں گا، اوراماں سے کہوں گا اب کبھی اس سے ادھار نہ لے، کبھی بھی نہیں، مر کے بھی نہیں" ۔۔اس نے اپنی شلوار کو سختی سے پکڑ لیا جیسے ابھی دکاندار اپنی دی ہوئی دھمکی کو سچ کرنے آ رہا ہو اور پھر سے ذلت کے آنسو حلق میں نمک گھولنے لگے۔

اب وہ بس سٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں اس نے دوسرے شہروں سے آنے والی بسوں کے مسافروں کو ٹھنڈا پانی بیچنا تھا۔

آج بہت شدت کی گرمی تھی، بلا کی لُو چل رہی تھی اور اسی وجہ سے اسے امید تھی کہ آج اس کا ٹھنڈا پانی بہت بکے گا۔ ماں کے دیئے ہوئے پیسوں سے اس نے برف خریدی، پاس لگے پانی کے ہاتھ والے نلکے سے بالٹی بھری اور برف اس میں ڈال دی۔ اس کا اپنا حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ اپنی پیاس اس نے میونسپلٹی کے نلکے سے بجھانے کی ناکام کوشش کی، مگر تپتا ہوا پانی اس کے حلق کو ٹھنڈ نہ پہنچا سکا۔ اس کے باوجود اس نے ٹھان رکھی تھی کہ ایک بھی ٹھنڈے پانی کا گلاس ضائع نہیں کرے گا، سب بیچے گا اور واپسی پر بشیرے سانڈ کے منہ پر پیسے مارے گا۔۔

کڑک دھوپ میں درخت بھی مرجھائے کھڑے تھے۔ اس نے سوچا، یہ بچارے بھی ایسے سر جھکائے کھڑے ہیں جیسے ان کا بھی باپ مر گیا ہو، اور جیسے ان کی ماں بھی لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھتی ہو اور رات کو نڈھال چارپائی پر ڈھیر ہو جاتی ہو، جیسے ان پر بھی گلی کے کتے بھونکتے ہوں، جیسے بشیرا سانڈ آتے جاتے انہیں گالیاں دیتا ہو، سر پر تھپڑ مارتا ہو، اور پھر نالی میں دھکہ دے دیتا ہو۔۔۔۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نے کوئلہ گھسیٹ دیا ہو، اس نے آنکھیں ملیں اور درختوں سے کہا: یار تم تو سر اٹھا دو، تمھیں کس بات کا ڈر؟

مسکرا دو یارو۔۔۔ کوئی تو مسکرا دے۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اصغر کے معصوم سے

چہرے پر مسکراہٹ ایک بار پھر پھیل گئی۔

اسی سمے سٹاپ پر ایک بس رکی اور اس کے رکتے ہی وہ لپک کر گیا اور اس کی کھڑکی کے ساتھ چمٹ گیا، پانچ چھ گلاس تو فوراً ہی بک گئے، مگر ابھی وہ کھڑکی سے چپکا ہی ہوا تھا کہ بس چل پڑی اور اگر کنڈکٹر اس کا ہاتھ کھڑکی سے نہ چھڑواتا تو اس نے جوش میں ایسے ہی چپکے رہنا تھا۔۔۔ بس کے اندر سے ایک جھنجھلائی ہوئی سی آواز اس کے کان میں پڑی" توبہ ایسے لالچی کمینے لوگ ہوتے ہیں، پیسے کے پیچھے جان گنوا دیں گے، چلتی بس سے لٹکے ہی جا رہا ہے"۔ اصغر نے جاتی آواز اور بس کو ہاتھ ہلایا اور پیسے گن کے، بغیر مسکرائے، بڑی مسکین سی صورت بنائے جیب میں ڈال لئے۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ شدید دھوپ سے بچنے کے لئے کسی سایہ دار درخت کے نیچے جا بیٹھے کہ اچانک اس کے سر پر زور کا دھکہ ہوا، سکول سے بھاگے پانچ چھ نوجوانوں کی ایک ٹولی نے اس کے سر پر اپنے بستے مارے اور اس کے ہاتھ سے ٹھنڈے پانی کی بالٹی کو چھین لیا۔۔ حواس قائم ہوتے ہی اصغر بھاگ کر اس لڑکے تک پہنچا جس کے ہاتھ میں بالٹی تھی، اسے آتا دیکھ کر اس لڑکے نے بالٹی جلدی سے دوسرے کے حوالے کر دی، اب اصغر دوسرے کی طرف بھاگا، تو اس نے تیسرے کے حوالے کر دی اسطرح اصغر بالٹی کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔۔ لڑکے بالٹی کو دائرے میں گھمانے لگے اور ساتھ ساتھ پانی پینے اور ایک دوسرے پر اچھالنے لگے۔

اصغر بھاگنے کے ساتھ ساتھ اب ان کی منتیں بھی کرنے لگ گیا۔ اس کی منت سماجت نے نوجوان لڑکوں میں اور توانائی بھر دی۔ اصغر کی بے بسی حد سے بڑھ گئی تو اس نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

اس کو روتا دیکھ کر لڑکوں کے پٹھے اور بھی پھڑکنے لگے۔۔" چڑی کا بوٹ۔۔۔ ہا

ہا" ۔ چڑی کا بوٹ ۔۔ بوٹ ای اوئے ۔۔ اسکا رونا لڑکوں کے قہقہوں اور شور میں دب گیا، پھرا یکدم سے دو لڑکوں نے اسے اپنے درمیان دبوچ لیا اور اس کے کمزور سے جسم کو اپنے ساتھ لگانے لگ گئے ۔ اسے اپنے آگے پیچھے تناؤ محسوس ہوا تو وہ پانی اور بالٹی کو بھول کر اپنے آپ کو چھڑوانے لگ گیا، آنسو سہم کر تھم گئے ۔۔

بشیرا، کالی بلی، فقیر اور کتا سب چہرے مہربان لگنے لگ گئے مگر اب وہ کسی بہت ظالم مخلوق میں پھنس گیا تھا یہ احساس ہوتے ہی اس کے جسم کی ساری جان اس کے پھیپھڑوں اور گلے میں آ گئی" بچاؤ بچاؤ" ۔ اس کی چیخوں کی آواز سن کر کچھ دکاندار جو پہلے دور بیٹھے قہقہوں کی آواز سن کر یہ سمجھ رہے تھے کہ جوان بچے سکول سے چُھٹ کر مستیاں کر رہے ہیں ، اب چیخوں کی آواز سن کر بے اختیار ان کی طرف لپکے ۔ لڑکوں نے جیسے ہی انہیں آتا دیکھا تو اصغر کو چٹکیاں بھریں، پیچھے دھکا دیا اور یہ جا وہ جا ۔۔

دکانداروں نے انہیں بھاگتے دیکھا تو اصغر کو دیکھے یا اٹھائے بغیر واپس اپنی دکانوں کو لوٹ گئے، جیسے اس سے زیادہ وہ اصغر کے اوپر وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔

اصغر نے جان بچتے ہی پھر سے پوری ہمت سے سوچا:

"اب تک جو پیسے بنائے ہیں ان کی اور برف لے کر جلدی سے، اگلی بس کے آنے سے پہلے، اور ٹھنڈا پانی بنا لے ۔۔" یہ سوچتے ہی اس نے اپنی جیب ٹٹولی، مگر یہ کیا وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا، اصغر کے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ چمکنے لگا، جاتے جاتے وہ لڑکے اسکی جیب بھی خالی کر گئے تھے ۔ ان کی شکلوں سے لگ رہا تھا یہ ان کی ضرورت نہیں بلکہ تفریح ہے ۔ اصغر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے جلدی سے بالٹی کے اندر جھانکا ایک چھوٹا سا برف کا ٹکڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔ اصغر بھی اسے دیکھ کے مسکرایا ۔۔ جیسے دونوں نے فیصلہ کر لیا ہو کہ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ۔۔۔ یا جیسے وہ دونوں دنیا کو بتانا چاہتے ہوں کہ سب چھین لو مگر یہ مسکراہٹ ایسے ہی ہونٹوں پر رہے گی۔

ان لڑکوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے رو رو کے اور چیخ چیخ کے اب اصغر کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے، اب بشیرے دکاندار کی گالیاں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں ۔ اب صرف پیاس اس کے سامنے زندگی کا سب سے بڑا چیلنج بن کر کھڑی تھی ۔ اسے زندگی کا مقصد صرف ایک ٹھنڈے پانی کا گلاس حاصل کرنا لگ رہا تھا ۔ اس نے جلدی سے وہ چھوٹا سا برف کا ٹکڑا منہ میں رکھنا چاہا، صبح کے کھائے ہوئے پاپے نہ جانے کب کے ہضم ہو چکے تھے، اور اس کے ہاتھ بھوک اور گرمی سے کانپ رہے تھے، کانپتے ہاتھوں سے برف کا ٹکڑا پھسل کر سڑک کے درمیان جا پڑا ۔۔ وہ تلملا اٹھا، غصے سے اس کا رواں رواں کانپنے لگا ۔۔ صبح سے لے کر اب تک جتنی بھی ذلتوں کا سامنا کیا تھا وہ اس کے سامنے رقص کرنے لگ گئیں ۔۔

"سب نے مارا مجھے، سب نے ہرایا اور اب اس کمزور سے برف کے ٹکڑے سے بھی ہار جاؤں؟ ۔۔ لعنت میری ہڈحرامی اور بزدلی پر، اب نہیں ایسا ہو گا، مجھے یہ ٹکرا نہیں ہرا سکتا ۔۔ ایسی کی تیسی اس کی ۔۔"

سوچوں کی یلغار میں اسے پتہ ہی نہیں چلا اور سڑک کے عین وسط میں برف کے ٹکرے کو پکڑنے کے لئے آتی جاتی کاروں میں بندر کی طرح پھدک پھدک کر اپنے آپ کو بچانے لگا ۔ سڑک تھی کہ بے ہنگم ٹریفک کا ایک طوفان تھی ۔۔

" مگر اب کے وہ جیت کے ہی رہے گا "اس نے خود سے کہا اور چھلانگ لگا کر برف کے ٹکڑے کو سختی سے گرفت میں لے لیا، ابھی فتح کی مسکراہٹ اس کے لبوں تک پہنچی بھی نہ تھی کہ اسی وقت ایک بدمست ڈرائیور نے اگلے سٹاپ سے پچھلی وین کو ریس میں ہرا کر سواریاں اٹھانے کے چکر میں اسے ایسی ٹکر ماری کہ وہ خون میں لت پت اچھل کر سڑک کے کنارے آ گرا مگر اس نے ہاتھ سے برف کا ٹکڑا نہیں چھوڑا اور اسی حالت میں خود ٹھنڈا ہو گیا۔

ایک کمزور سی، اپنی لڑائی لڑتی پھدکتی ہوئی زندگی جب موت میں تبدیل ہوگئی تو اردگرد کے لوگ جیسے نیند سے جاگ اٹھے، ہر طرف شور مچ گیا، "پکڑو ڈرائیور کو جانے نہ پائے۔۔بچہ مر گیا کہ بچ گیا؟ کون ہے؟ کس کا بچہ ہے؟" اصغر کی فکر میں سڑک آوازوں سے بھر گئی۔

کم بخت اب ذرا سا بھی سانس لے رہا ہوتا تو دیکھتا دنیا ایسی بھی بے حس نہیں ہے۔۔

"ڈرائیور بھاگ گیا" ایک تاسف بھری آواز ابھری۔

"لعنت بھیجو، اسے اللہ خود پوچھے گا، اب یہ دیکھو، یہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟ ایک لمبی داڑھی والے بزرگ نے لاوارث بچے کی لاش کو دیکھتے ہوئے مجمعے کو مخاطب کیا تو اس مسئلے" یہ بچہ کس کا بچہ ہے " کے حل کے لئے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔۔

"پتہ نہیں کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ ہجوم میں آوازیں بڑھتی گئیں۔

پھر مجمعے سے ایک شخص آگے بڑھا اور مردہ جسم کے بارے میں جاننے کی سعادت اس کے چہرے پر تھی" میں جانتا ہوں اسے، یتیم ہے۔ بیوہ ماں کا آخری سہارا تھا"۔ یہ کہتے ہوئے اپنی اہمیت کے احساس سے اس کا چہرہ دمکنے لگا اور اس انکشاف سے رحم دل لوگوں کے دل کٹ کے رہ گئے۔

اصغر کو بڑے احترام سے اٹھا کر لوگوں کا یہ جلوس اس جاننے والے شخص کی رہنمائی میں اصغر کے گھر کو روانہ ہوا۔۔اصغر کی بند مٹھی سے برف پگھل چکی تھی اور اس کا جسم برف سے زیادہ ٹھنڈا ہو چکا تھا، اس کی جیب میں سے" بشیرے کے منہ پر مارنے والے پیسے" پھر سے کوئی اچکا نکال کے لے گیا تھا، ماں نے جو تپتی دوپہر میں بیٹے کا ٹھنڈا جسم دیکھا تو بے ہوش ہوگئی، کچھ لوگوں نے سمجھا شائد وہ بھی مرگئی۔" ایسی سخت جان عورتیں اتنی سی بات پر تھوڑے ہی مرتی ہیں۔۔۔ محلے کی معزز شیخنی نے دوسری عورتوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔۔ انشااللہ ابھی اٹھ جائے گی"۔ شیخنی کے انداز سے نہ حقارت کا پتہ چلا نہ رحم کا۔۔

اس موت میں پتہ نہیں کیا خاص بات تھی کہ اپنا محلہ چھوڑ، باقی کے محلوں سے بھی لوگ جوق در جوق اکٹھے ہو رہے تھے۔ شائد بہت دنوں سے ان محلوں میں کوئی موت نہیں ہوئی تھی یا شائد ایسی موت نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں سے گلی بھرتی گئی، تِل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔۔ایسا بڑا ہجوم دیکھ کے اُسی بشیرے دکاندار کی غم میں ڈوبی آواز ابھری:

"ہٹ جاؤ پیچھے، جنازے کے سارے انتظامات میں کروں گا، اس کے بھائی اور بہنوں کے پہنچنے تک تدفین نہیں ہوگی، ان یتیم بچوں کے سر پر میرا ہاتھ ہے اور یہ اصغرا۔۔ ہائے ہائے!! اس کو تو میں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ لگتا تھا اس کو پیار کروں گا تو اس کے صدقے جنت کا دروازہ کھل جائے گا اور آخرت میں پیارے حبیب کے قریب بیٹھنے کا موقع ملے گا۔۔"

"سبحان اللہ۔۔" مسجد کے امام نے دکاندار کو تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا،
" آپ جیسے لوگ ہی محلے کی کمیٹی میں صدر بننے کے قابل ہیں، ماشااللہ جیت آپ ہی کی ہوگی"۔ دکاندار کے منشی اور چار پانچ اور چمچوں نے " واہ واہ" کے نعرے بلند کئے ۔۔"بشیر صاحب زندہ باد۔

"بھائی بہنوں کے آنے میں نجانے کتنا وقت لگ جائے، گرمی تو اس معصوم نمانے کو گال کے رکھ دے گی" محلے کے ایک اور چوہدری نے جلدی سے بشیر دکاندار کی بتی گُل کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔

بشیرا آج محلے کی کمیٹی کا الیکشن جیت کر ہی جانا چاہتا تھا فورا بولا،

" کریمے بھاگ کے برف خانے جا، گرم ہوا نہ پڑے اس یتیم کو، برف سے سجا دے میرے بچے کو۔۔۔"

گلی، "واہ واہ سبحان اللہ" کے شور سے گونج اٹھی اور بشیرے نے مخالف چوہدری کو بڑی چھبتی نظروں سے دیکھا اور پھر بڑی عاجزی سے سر جھکا کے جنازے والی چار پائی کی

پائینتی کے ساتھ لگ کر رونی سی صورت بنالی۔

تھوڑی ہی دیر میں برف کی سلیبوں کے ڈھیر مردے کے گرد کھڑے کر دئے گئے ۔ پتہ نہیں وہاں کھڑے لوگوں کو ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ برف کی سلیبیں کھسیانی ہنسی ہنس رہی ہیں اور ان کے حلق میں نمک گھل رہا ہے ۔۔

"ہٹو! بڑی بہن بھی پہنچ گئی، ہٹ جاؤ"۔ایک ماتم زدہ آواز نے اطلاع دی، ایسے موقعوں پر ایسی آوازیں لگانے والے ہجوم میں اپنی اہمیت منوانے پر تُلے ہوتے ہیں، ان بچاروں کے پاس بھی یہ سب کرنے کے بس یہی مواقع ہوتے ہیں۔

"دوسری بہن اور بھائی بھی بس پہنچنے والے ہیں، ایک اور بالکل ویسی ہی آواز نے مجمعے کو اپنی معلومات سے باخبر کیا۔

"اصغرے کی ماں کو بھی ہوش آ گیا ہٹ جاؤ پیچھے،، ماں کو بچے کا منہ دیکھنے دو۔۔ ہٹ جاؤ" ماں نے بس آنکھیں ہی کھولی تھیں ابھی ہوش میں آنا باقی تھا لیکن اصغر کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی، "میرا دل کہتا ہے اماں آج بڑی بِکری ہوگی، بڑی اچھی دیہاڑی لگے گی۔۔"

دیہاڑی تو بڑی اچھی لگ گئی اصغرے، دیکھ اٹھ ۔۔ دیکھ تیرے اردگرد برف کا کارخانہ کھڑا ہے۔۔تُو ایک ٹکڑے کے لئے پیسے جوڑتا تھا اب دیکھ برف کے ڈھیر کے ڈھیر تیرے گرد کھڑے ہیں، کیا ہوا ان کی قیمت بس ایک تیری زندگی تھی، ایک تیری ناکارہ جان۔۔۔

۔۔دیکھ برف ہی برف۔۔۔۔۔ ہر طرف برف ہی برف۔۔۔۔اصغر کی سختی سے دبی مٹھی کو کچھ لوگ زور لگا کر کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔اور حیران تھے کہ "پتہ نہیں بچے نے خالی مٹھی اتنے زور سے کیوں بند کر رکھی ہے؟"۔اور ماں بس برف برف چلاتی جارہی ہے۔

قصور کے کھُسے

مجھے اپنی لاہور والی خالہ کے گھر آئے ابھی دوسرا ہی دن تھا کہ خالہ نے بتایا کہ وہ اپنی کالج کی ٹیچرز دوستوں کے ساتھ اپنے طلاق یافتہ بھائی کے لئے شہر قصور کسی کا رشتہ دیکھنے جا رہی ہیں اور مجھے بھی ان کے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں نے ابھی لاہور کے کالج میں داخلہ فارمز جمع کروانے تھے۔ میں نے امی ابا کو بتا دیا تھا کہ بی اے مجھے سیالکوٹ سے نہیں بلکہ لاہور سے کرنا ہے انہوں نے بڑی ہی مشکل سے اجازت دی تھی۔ پتہ نہیں کیا تھا میں پیدا سیالکوٹ میں ہوئی تھی، پلی بڑھی بھی وہیں پر تھی مگر لاہور، یوں لگتا تھا میرے اندر بستا ہے۔ یہاں کی ہواؤں اور فضاؤں میں ایک عجیب سا جنون تھا۔۔ یہاں کی سڑکوں پر چلتے چلتے ایکدم دل کرنے لگتا کہ اونچی آواز میں گانا گانے لگ جاؤں اور جب سب آتے جاتے لوگ میری طرف متوجہ ہو جائیں تو کوئی گاڑی آئے اور مجھے اسی سڑک پر کچلتی ہوئی چلی جائے اور میرے جسم کا پرنٹ سڑک پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جائے۔۔کبھی پتنگوں سے بھرا آسمان دیکھ کر دل کرتا کہ ایک پتنگ بن کر ان میں شامل ہو جاؤں اور سب کو کاٹ دوں اور جب آسمان خالی ہو جائے تو لاہوریئے صرف ایک پتنگ اڑتی دیکھیں۔۔ایسے وحشیانہ خیالات آتے جن کا نہ کوئی سر ہوتا نہ پیر، بس خون میں سرد لہریں دوڑاتے رہتے۔لاہور آ کر میں کبھی نارمل نہیں ہوتی تھی، پتہ نہیں کیا ہے اس شہر میں اور ہر شہر میں کچھ نہ کچھ خاص ہوتا ہوگا مگر لاہور کا خاص اس کی ہواؤں میں پاگل کر دینے والی کوئی خوشبو تھی۔۔۔

"خالہ قصور کا کیا خاص ہے۔۔" مجھے جب یہ پتہ چل گیا کہ وہاں جائے بغیر گذارا نہیں تو سوچا قصور شہر کا کچھ حال ہی پوچھ لوں۔۔۔

"بیٹا کیا خاص؟ لاہور سے جڑا ہوا شہر ہے۔ بابا بلھے شاہ کا دربار ہے۔قصور کے کھسے بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔اور۔۔اور تو کچھ خاص یاد نہیں آرہا، بس آدھ گھنٹے میں لاہور سے قصور پہنچ جاتے ہیں۔۔پھر ہنس کے بولی ہاں! قصور کا کیا قصور کہ ہم وہاں نہ جائیں۔۔"

پھر خالہ کی لش پش کرتی سہیلیاں آدھمکیں۔ پتہ نہیں کیسی کالج کی پروفیسرز تھیں کہ دھیما پن نام کو نہیں تھا۔ایک نے تو بہت ہی آنکھوں کو چبھنے والا میک اپ کیا ہوا تھا اور دوسری کے کپڑے خوب بھڑکیلے سبز رنگ کے تھے، یعنی دونوں نے خوب نظر آنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔۔

"لوکل بس پر ہی جانا پڑے گا۔۔" تیز میک اپ والی نے آتے ہی اعلان کیا۔۔

" کیوں تمھاری گاڑی کدھر ہے؟۔۔خالہ سٹپٹا کر بولی۔۔ میں نے تو اس بچی کو بھی ساتھ لے کر جانا ہے، گھر کوئی نہیں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔۔" خالہ نے میری طرف اشارہ کیا۔۔

" ہاں ہاں تو یہ بھی بس میں بیٹھ جائے گی ۔اب بھڑکیلے سبز لباس سے آواز ابھری۔۔

" گاڑی تو صبح ایسی بغیر وجہ کے خراب ہوئی کہ سٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔۔۔" میک اپ والی نے لقمہ دیا۔

"چلو پھر جیسے تمھاری مرضی ، نکلتے ہیں ابھی ، میری گاڑی بھی گئی ہوئی ہے ۔۔چلو پھر۔۔" خالہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لاہور قصور کی بس کا بھی اپنا ہی ایک منظر تھا۔۔ جتنے لوگ سیٹوں پر بیٹھے تھے اس

سے دگنے لوگ کھڑے تھے۔ مجھے خالہ نے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا، تاکہ کسی کا ہاتھ نہ چھو جائے۔ میں ان تینوں ادھیڑ عمر کی خواتین میں ایک معصوم بھیڑ کی طرح پھنسی ہوئی تھی۔۔وہ تینوں مسلسل بولے جا رہی تھیں لیکن اپنی گفتگو میں وہ یہ دھیان ضرور رکھ رہی تھیں کہ میں آدمیوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہوں۔ باتوں کا موضوع ، موسم ، بس کے رش ، اپنے کالج کے کچھ قصوں سے ہوتا ہوا قصور مشن پر آ کر رک گیا تھا۔ان کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ وہ دونوں خواتین اپنے لمبے چوڑے حسین پڑھے لکھے برسر روزگار بھائی کے لئے جو لڑکی دیکھنے جا رہی تھیں، وہ میری خالہ کے کسی پرانے کلاس فیلو کی بہن تھی ، اور خالہ اپنے کلاس فیلو کے حسن اور ذہانت کے قصے تو سناتی جا رہی تھیں مگر شائد انہوں نے لڑکی کو نہیں دیکھ رکھا تھا مگر خالہ کی کھینچی گئی بھائی کی تصویر سے ان دو خواتین کا بھی میری طرح یہی تصور بن گیا کہ لڑکی بھی ویسی ہی ہوگی۔اس تسلی کے بعد ان کی یہ تشویش شروع ہو جاتی کہ کیا اتنی پیاری اور ذہین لڑکی ان کے طلاق یافتہ بھائی کو مل بھی سکے گی یا نہیں؟۔کہیں یہ سفر رائگاں نہ چلا جائے جو کہ بس کی دھینگا مشتی میں اب سفر با مشقت بن چکا تھا۔۔ان کے لطیفے، واقعات اور خدشات سن سن کر آدھ گھنٹے میں ہی میرے کان پک گئے تھے۔اس کے علاوہ مجھے رشتہ دیکھنے دکھانے سے زیادہ گھٹیا کام اس دنیا میں اور کوئی نہیں لگتا تھا۔۔۔یہ بات سارے خاندان والوں کو پتہ تھی کہ مجھے رشتہ دیکھنے یا خود رشتہ بن کر سج سنور کر لوگوں کے سامنے آنے سے کیسی گھن آتی تھی۔۔کاش ہمت کر کے گھر میں اکیلے رہ لیتی مگر اس مصیبت کا حصہ نہ بنتی۔۔مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

خالہ کی پروفیسر سہیلیاں ، جن کا میک اپ اور شوخ کپڑے اس گرمی اور رش میں مجھے زہر لگ رہے تھے، ایک پل کو بھی خاموش ہو کر بیٹھنا نہیں جانتی تھیں، میں خالہ کے ساتھ دبکی بیٹھی رہی، ان کی شوخیوں کی وجہ سے بس میں کھڑے مسافر ہمیں ہی گھورتے جا رہے

تھے، انہیں بس ٹکٹ کے پیسوں میں شائد پہلی دفعہ ایسی تفریح میسر آ رہی تھی۔

بس سگریٹ کے دھویں سے بھری ہوئی تھی، میرا سانس بند ہو رہا تھا گھبرا کر میں نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کر دیا، وہاں کھلے میدان میں گھاس پر چرتی بھینس بہت قابلِ رشک لگ رہی تھی، کیسی آزاد اور کھلی فضا میں اپنی مرضی سے گھوم رہی ہے۔ ایسے ہی انسان کو اشرف المخلوقات کہتے ہیں، اشرف مخلوق تو یہ ہیں جنہیں کسی کا رشتہ دیکھنے دکھانے جیسا گھٹیا کام نہیں کرنا پڑتا۔ سگریٹ پسینے کی بُو اور شور نے لگتا تھا میرے حواس معطل کر دیئے تھے۔

جیسے ہی بس رکی میں ہجوم کو چیرتی ہوئی فٹاک سے نیچے اتر گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی، میری اس حالت کو دیکھ کر تینوں خواتین نے پھر سے ایک زوردار قہقہہ چھوڑا۔۔ جاتے ہوئے لوگوں نے پھر سے انہیں مڑ کر دیکھا۔۔ سب اپنا اپنا فرض پورے کر چکے تو میں نے خالہ سے کہا

"'پلیز جلدی چلیں۔۔۔۔"

"توبہ کیا ہو گیا ہے؟ لاہور میں تو تم گھر میں ایک پل چین سے نہیں بیٹھتی ہو۔۔ اب کیا ہو گیا ہے؟۔

" کچھ نہیں خالہ بس جلدی چلیں۔۔۔ میں نے بیزاری سے کہا، مجھے بس سے نیچے اتر کے لگ رہا تھا میں اٹھارہ سال کی نہیں بلکہ کوئی ساٹھ سال کی بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اب اندازہ ہو رہا تھا ان بسوں میں سفر کرنے والے کیوں اتنے بیزار اور بوڑھے سے لگتے ہیں۔۔۔

خالہ نے اپنی ازلی پھرتی سے تانگے والے کو روک بھی لیا تھا۔۔ خالہ نے اسے اپنے ہینڈسم پرانے کلاس فیلو پروفیسر کا نام بتایا جس کی بہن کا رشتہ دیکھنے ہم جا رہے تھے، تو

تانگے والے نے زور زور سے سر ہلایا۔۔

ایسی چھوٹی جگہوں کے یہی فوائد ہوتے ہیں کوئی ایڈریس دینے کی ضرورت نہیں پیش آتی، بس نام اور پیشہ بتاؤ تو تانگہ ہو یا رکشہ سب منزلِ مقصود کی طرف سرپٹ بھاگنے لگتے ہیں۔۔ بلکہ تانگے میں بیٹھے بیٹھے ہمیں یہ خبر بھی مل گئی کہ پروفیسر تقی کے محلے میں آخری بچہ کس دن پیدا ہوا اور آخری موت کب واقع ہوئی اور میں نے سوچا تانگے والا نہ ہوا پورے قصور کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہو گیا۔۔۔

مجھے ان دو خواتین کی تانگے والے کی معلومات میں دلچسپی دیکھ کر وہم ہوا کہ کہیں یہ اس سے لڑکی کے بارے میں نہ جانچ پڑتال شروع کر دیں۔۔ مگر شکر ہے اتنی عقل ان میں تھی کہ بس باقی خاندان کے بارے میں ہی پوچھتی رہیں، گرمی سے ان کے چہرے کا میک اپ پگھل رہا تھا، جس سے چہرے ڈھب کھڑبے سے لگ رہے تھے۔۔ مگر وہ اس بات سے بے نیاز تھیں اور مسلسل بولتی جا رہی تھیں۔۔

اب جیسے جیسے تانگہ منزل کے پاس پہنچ رہا تھا میرے اندر ایک خوف بڑھتا جا رہا تھا ایک ان دیکھی لڑکی کا۔۔ میں ایک ایسے مشن کا نہ چاہتے ہوئے حصہ بن گئی تھی، جس سے مجھے سخت نفرت تھی اور اس کے کے باوجود میرے ساتھ بھی زندگی کے کسی موڑ پر یہی کچھ ہونے والا تھا۔۔ میرے چہرے، قد کاٹھ، آواز، ہنسی اور چلنے کی سپیڈ ناپی جانی تھیں اور میں نے بھی کبھی نہ کبھی اس رواج کی بھینٹ چڑھنا تھا۔۔ کیونکہ ہر شریف لڑکی کو اسی مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے جو لڑکیاں اس مرحلے سے بچ کر اپنی پسند کا راستہ چن لیں تو ان کی شرافت مشکوک ہو جاتی ہے اور میں تو شریف نہ کہلائے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔۔

لاہور میں اڑنے والی ساری پتنگوں کو کاٹ بھی دوں تو آسمان پر اکیلے کتنی دیر تک اڑا جا سکتا ہے؟ میں نے تانگے سے اترتے ہوئے بھونڈے پن سے سوچا۔

تانگے والے نے چھوٹے سے گھر کے آگے تانگہ روکا تو میک اپ زدہ چہرے مزید مرجھا سے گئے۔ دونوں نے تانگے والے کو پیسے دیتے ہوئے، خالہ کو شکایتی نظروں سے دیکھا۔۔۔

"مجھے بھی نہیں پتہ بابا پہلی دفعہ آئی ہوں، پروفیسر تقی تو بہت سمارٹ اور اچھے گھر کا لگتا تھا، مجھے کیا پتہ۔۔۔" خالہ نے ان کی نظروں میں آئے سوال کو پڑھ لیا اور اپنا دفاع کرنے کی ناکام سی کوشش کی اور ساتھ ہی دروازے پر لگی بیل کا بٹن دبا دیا۔۔۔

یوں لگتا تھا کوئی انتظار میں ہی دروازے کے ساتھ لگ کے بیٹھا ہے۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔۔۔

"آیئے آیئے۔۔۔ اندر سے ایک بوڑھی عورت نے گرمجوشی سے کہا۔۔۔

خالہ نے اڑی رنگت کے، اندر کو دھنسے ہوئے صوفوں پر بیٹھتے بیٹھتے سب کا آپس میں تعارف کروایا۔۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا بچہ، شربت کے گلاسوں کی ٹرے کے ساتھ ،کسی جن کی طرح ان کے آگے حاضر ہو گیا۔۔۔

"نہیں نہیں ہم ذرا جلدی میں ہیں لڑکی کو بلا دیں۔۔۔ بہت کام چھوڑ کر آئے ہیں۔۔" تیز میک اپ نے اپنے آگے کئے گئے شربت کے گلاس کو نخوت سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

" گرمی بہت ہے آپ پلیز پانی تو پی لیں۔۔ بوڑھی عورت نے لجاجت سے کہا اور میں نے اس کی شرمندگی کو کم کرنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کر جلدی سے شربت کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں اپنے اندر انڈیل لیا اور پھر ایسے بوڑھی کو دیکھا جیسے یقین دلا رہی ہوں کہ" تمھارے گھر میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا" ۔۔۔ مگر بوڑھی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور پردہ اٹھا کر گھر کے اندر اپنی لڑکی کو لینے

چلی گئی۔

اس کے اندر جاتے ہی خالہ نے دونوں کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا:

" فکر نہ کرو گھر بار پر نہ جاؤ، بھائی کی دوسری شادی ہے تو ایسے ہی چھوٹے گھروں کی لڑکیاں ہمارے کام آسکتی ہیں ،ہم نے کون سا یہاں لڑکی دینی ہے ،یہاں سے تو لے کر جانی ہے نا تو بس لڑکی اچھی ہونی چاہیئے باقی خیر۔۔ اور پروفیسر تقی اتنا پیارا ہے تو بہن بھی پیاری ہی ہو گی"۔۔۔۔

"تم تو بس پروفیسر تقی کی تعریفیں ہی کرتی رہنا"۔۔۔ سبز کپڑوں والی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی، کہاں بس میں ان خواتین نے اپنے قہقہوں سے بس کی چھت اٹھا رکھی تھی اور کہاں اب ہونٹ مسکراتے ہوئے بھی تکلیف میں لگ رہے تھے۔۔۔

لڑکی کی ماں لڑکی کو لے آئی تھی ۔۔ اسے دیکھتے ہی تینوں خواتین یوں اچھل کر صوفے سے کھڑی ہو گئیں جیسے کسی بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔۔

خوبصورت ہونا تو دور کی بات لڑکی بدصورت بھی نہیں تھی، اس کے چہرے کے نقوش ابنارمل تھے اور سر بھی قدرے چھوٹا تھا، تینوں عورتیں اپنی اپنی جگہ پتھر بنی کھڑی رہیں۔ لڑکی نے تھوڑی دیر وہاں کھڑے ہو کر انہیں دیکھا، اور پھر وہ دھیرے سے جیسے آئی تھی ویسے ہی کمرے سے نکل گئی۔ میرے علاوہ اس کے جانے کا بھی کسی کو احساس نہ ہوا۔

پھر عورتیں بوڑھی کی لرزتی آواز سے چونکیں جو کہہ رہی تھی" ہم کھانے کا انتظام کر رہے ہیں، آپ لوگ آرام سے بیٹھیں" ۔۔۔

وہ سب عورتیں آواز سے چونک تو گئیں مگر شائد انہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔۔

بوڑھی دوبارہ دروازے سے اندر چلی گئی تو خالہ ایک دم سے تیز آواز میں بولی جیسے مجرم کو صفائی کا موقعہ آخری بار ملا ہو۔۔۔

"اللہ کی قسم مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔۔دیکھو پروفیسر تقی کو بتانا چاہیئے تھا۔۔یہ تو دھوکہ ہوا نا"

"بالکل دھوکہ ہے۔۔آپ کے ساتھ پروفیسر تقی نے کیا اور آپ نے انجانے میں ہمارا وقت برباد کر دیا۔۔" تیز میک اپ والی کے انداز سے اب بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ خالہ کی بے تکلف دوست ہے۔ وہ بولی تو مجھے یوں لگا جیسے وہ خالہ کو جانتی ہی نہ ہو۔۔

"دیکھیں مجھے ہلکا سا بھی اندازہ نہیں تھا، ورنہ جب آپ کی گاڑی خراب ہوگئی اور میری کار بھی نہیں تھی تو اسے ہی ہم قدرت کا اشارہ سمجھ لیتے۔۔" خالہ نے ابھی بھی ان کے ساتھ اپنا الحاق جاری رکھا۔۔

"ہاں بس بدشگونی کو سمجھ لیتے تو اتنا وقت نہ برباد کرتے، بس میں دھکے کھاتے آئے ہیں اس نمونے کو دیکھنے"۔۔۔ تیز رنگ کے لباس والی نے خالہ کی ہاں میں ہاں ملا کر گویا انہیں اس جرم کی تھوڑی سی معافی دے دی تھی۔۔

"خالہ آہستہ بولیں وہ لوگ سن لیں گے"۔۔ میں جو خود اس لڑکی کے چہرے کو دیکھ کر ڈر گئی تھی مگر پھر بھی یہ سمجھ بیٹھی کہ اس لڑکی کو بچانے کا بوجھ میرے کندھوں پر آ گیا ہے۔

"ارے سنتے ہیں تو سن لیں۔۔کردار کی بدصورتی تھوڑی ہے کہ چھپا سکیں گے یہ تو چہرے کی بدصورتی ہے، سامنے نظر آنے والی، اس پر ایسی ڈھٹائی ان لوگوں کی۔۔۔"۔ سبز سوٹ نے بے تکلفی سے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا، جیسے اب خالہ کے جرم کی سزا وہ ان کے گھر کے کسی بھی فرد کو دینے کی مجاز ہوگئی تھیں۔

"اللہ کی مار ہو۔۔۔ خالہ اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے، پروفیسر تقی کو بھی کوستی جا رہی تھیں۔۔ بڑی عزت تھی اس پروفیسر کی میری نظروں میں، مٹی میں مل گئی ساری، ایسا تیز اور جھوٹا آدمی"۔۔کیا سمجھتا تھا کہ ہمارے لڑکے کی دوسری شادی ہے تو کچرا اٹھا کے لے جائیں گے۔۔۔خالہ اپنی سہیلیوں کو اپنی اپنائیت کا احساس دلانے میں اتنی مگن تھیں

کہ انہیں یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ گھر والے سن لیں گے۔

"خالہ خدا کا واسطہ آپ لوگ باہر آ کر یہ ڈسکشن کر لیں۔۔کچھ تو خیال کریں"۔۔ میں نے خالہ کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔

"چپ کرو تم، ان کا خیال کریں؟ گرمی سے دماغ تپ گیا، ارے اس سے اچھا تو قصور کے کھسے خریدنے آ جاتے۔۔" خالہ نے اپنی دوستوں کو خوش کرنے کے لئے آخری ہتھیار استعمال کیا۔۔

"خالہ۔۔آنٹی۔۔پلیز۔۔۔" ہائے! سب سن لیا ہو اس لڑکی نے پر یہ کھسوں والی بات نہ سنی ہو"۔۔۔ میں نے دل میں دعا کی

پھر تینوں تیزی سے باہر کو لپکیں۔۔ میں ان کے پیچھے بھاگی۔

باہر والے دروازے کے پاس پہنچ کر خالہ نے رسماً آواز لگائی" ہم جا رہے ہیں"۔

ماں بیٹی اور وہی چھوٹا سا بچہ، سب ہراساں سے ہو کر باہر کو لپکے۔۔" آپ بیٹھیں تو سہی،، تقی آتا ہی ہوگا۔۔کھانا بس لگا رہے تھے، ٹیبل پر،۔۔آپ بیٹھیں۔۔۔" بوڑھی عورت کی آواز مذید لرزنے لگ گئی تھی۔۔

"نہیں دیر ہو رہی ہے۔۔" خالہ بولی

" آپ۔۔۔" بوڑھی اتنا ہی کہہ پائی کہ خالہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی:

"بس ہم فون کر دیں گے"

"اچھا پھر گھر کا فون نمبر لے لیں، تقی کئی دفعہ پیغام نہیں دیتا۔۔۔" ماں شکست خوردہ سی بولی

وہ عورتیں تانگے والے کو رکوا بھی چکی تھیں اور خالہ نے بھی فون نمبر لئے بغیر اپنا رخ تانگے کی طرف کر دیا۔۔

میں نے پھر سے لڑکی کا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس کیا، اس کے ہاتھ میں پکڑی فون نمبر کی پرچی جو اس نے ماں کے کہنے پر لکھ کر ہماری طرف بڑھائی تھی، پکڑ لی۔۔

"ہم فون کریں گے۔۔ضرور۔۔" میں نے کسی بڑے بوڑھے کی طرح یقین دہانی کروائی کیونکہ وہ تینوں تانگے میں سوار بھی ہو چکی تھیں۔۔۔

"ہاں فون کرو تو یہ ضرور بتانا کہ میں اچھی ہوں یا قصور کے کھُسے؟" لڑکی نے سپاٹ لہجے سے کہا۔

مجھے لمحے بھر کو لگا میرا دل بند ہو گیا ہے اور بوکھلاہٹ میں میرے ہاتھ سے فون نمبر والی پرچی نیچے گر گئی۔۔

لڑکی نے انہی سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھتے دیکھتے اپنے پیروں کے نیچے اُس پرچی کو مسل دیا اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی:

"اللہ نگہبان۔۔۔اپنا خیال رکھنا۔۔۔"

تیرھواں سال

تیز موسلا دھار بارش میں ایک ہاتھ میں دس کا نوٹ اور دوسرے میں اپنا گڈا پکڑے وہ بھاگتی جا رہی تھی۔

آج صبح سے ہی آسمان پر کالے کالے بادلوں کا بسیرا تھا اور رات کے اس پہلے پہر یہ بادل زمین پر اپنے سارے دن کا صبر نکال رہے تھے اور یوں لگتا مسلسل بارش زمین میں بڑے بڑے شگاف کر دے گی۔

فی الحال تو یہ برستا پانی اس چھوٹی سی بھاگتی، دوڑتی لڑکی کو بھگوئے جا رہا تھا، اس کے گیلے کپڑے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے، اور وہ اپنے چھوٹے سے دوپٹے کو بار بار اپنے کمسن سینے پر پھیلاتی جاتی تھی۔ اور جب بادل زیادہ ہی زور سے چنگھاڑتے تو وہ ہاتھ میں پکڑے گڈے کو اپنے ساتھ یہ یقین دلانے کو لگا لیتی کہ وہ اس سنسان گلی میں اکیلی نہیں ہے اور یہ گڈا اسے بجلی کے غضب اور بادلوں کی گرج سے بچا لے گا۔ اور پھر بھی جب اسے یہ خوف نہ چھوڑتا کہ یہ بجلی اس کے سر پر گر کر اسے جلا دے گی تو وہ با آوازِ بلند "بابا فرید گنج بخش"۔۔ کا ورد کرنے لگتی کیونکہ اس کی نانی نے بتایا تھا کہ بجلی بابا فرید کے نام سے ڈرتی ہے اور جو کوئی یہ ورد کرتا جاتا ہے اس پر کبھی نہیں گرتی۔ مگر نانی کا کیا بھروسہ، وہ تو بوڑھی ہو گئی ہے اسے تو باتیں ٹھیک سے یاد بھی نہیں رہتیں۔۔" اگر یہ بات غلط ہو، یا نانی کو کسی نے کچھ اور بتایا ہوا اور وہ بھول گئی ہو۔۔ ہائے اللہ۔۔ یہ بجلی آج مجھے جلا دے گی۔۔ یا بابا

فرید گنج بخش" اس نے گڈے کو اور سختی سے سینے سے بھینچ لیا، آواز اور بھی بلند ہوگئی، قدم اور بھی تیز تیز اٹھنے لگے۔

اس کے لئے موت ایک جل پری اور دنیا سے فرار کا راستہ تھی، وہ دنیا جس میں ابا کی ڈانٹ، اماں کی پھٹکار، بڑے بہن بھائیوں کی مار، چھوٹوں کے کام اور ان کے رونے کی بھدی آوازیں، محلے کی عورتوں کی چبھتی نگاہیں، گندے آدمیوں کی گندی نظریں اور ظالم سکول ٹیچرز کے ڈنڈے اور تھپڑ رہتے تھے۔ اس کے لئے موت ایسی تھی جس کا اوپر والا دھڑ انسانی تھا، سمجھ میں آنے والا، نیچے والے دھڑ میں ایک اسرار تھا اور ایک خوف، وہ قبر کے اکیلے پن اور ٹھنڈے اندھیرے سے خوفزدہ رہتی تھی، مگر کبھی کبھی اس کا دل چاہتا وہ اسی میں جا کر چھپ جائے۔

موت کی منزل کسے معلوم؟ ہوسکتا ہے وہ اسے ایسے جہاں میں لے جائے جہاں ایک خوبصورت سی گڑیا دلہن بنی بیٹھی ہو، اس کا سجا بنا گڈا اور گھر ہو اور جہاں رنگ برنگی تتلیاں اور لال، نیلی، سنہری پریاں ہوں، جہاں میٹھے پانی کی ندی اور پہاڑی سے گرتا جھرنا ہو، نرم گرم پھولوں کی کیاریاں ہوں۔۔ مگر اس سب کی کوئی گارنٹی نہیں اور کیا پتہ موت کے بعد کیا کہانی ہو؟ اس کے بارے میں کوئی آنکھوں دیکھی سچی کہانی نہ تھی، سب مفروضے، اندازے اور اسرار تھے۔۔ اس کا کیا بنے گا اگر وہاں صرف خون چوسنے والے اور گوشت کھانے والے کیڑے ہی ہوئے، بچھو، کالا اندھیرا اور قران پاک پڑھانے والے مولوی صاحب کے مطابق آگ ہی آگ۔۔ نہ بابا نہ۔۔ وہ جھرجھری لے کر رہ جاتی۔

"اف یہ آسمانی بجلی بھی جلا دیتی ہے، مرنے کے بعد بھی آگ میں پھینک دی گئی تو، اوئے میرے اللہ جلنے کی تو بڑی تکلیف ہے، اس سے بچانا میرے اللہ۔۔" اس نے اپنی نانی کے انداز میں دعا مانگی۔۔

"ہوسکتا ہے مرنے کے بعد کی بیگانگی بہت پیاری ہو، مگر جل کر مرنا"۔۔ ابا محلے کے ایک پاگل کے بارے میں کہتے تھے" بیگانہ ہے، مست۔۔ موجیں کر رہا ہے"۔" تو بیگانگی موج ہے"۔۔ وہ اکثر سوچتی۔

ایک دن اس کی خالہ اس کی اماں کو بتا رہی تھی کہ بچہ جننے کی بڑی تکلیف ہے، اللہ ایسی تکلیف کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے مگر بچہ ایسی نعمت ہے کہ سارا درد بھول جاتا ہے۔ مگر یہ بات کرتے کرتے خالہ کا درد ماتھے پر پسینے کی صورت ابھر آیا تھا۔ اور اس کے اندر تیرہ سال کی عمر میں، بغیر تجربے کے اتر گیا تھا۔ آگ میں جلے بغیر، قبر میں اترے بغیر اور بچہ جنے بغیر، اسے ایسے لگتا وہ ان سب تکلیفوں سے گزر چکی ہے، ایک جانا پہچانا سا ڈر اس کی رگوں میں اتر جاتا تھا۔۔

وہ اندھیرے اور بادل کی گرج سے بھی بہت ڈرتی تھی، نجانے ابا کو پتہ تھا یا نہیں مگر یہ جاننا ان کے لئے ضروری بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ابا نے جب اسے آواز دے کر بلایا تھا تو وہ بیٹھک میں اپنے دوستوں کے ساتھ بہت ضروری باتیں کر رہے تھے، بہت ضروری، اسی لئے تو ابا کے سب دوستوں کے چہرے بھی بہت سنجیدہ تھے۔ بھٹو کا نام آتا تو سب کے چہروں پر کرب چھا جاتا جیسے ان سب کے گھروں میں کوئی موت ہوگئی ہو اور ضیاالحق کے نام پر سب کے ماتھوں پر نفرت کی لکیریں سی پڑ جاتی تھیں۔ ادھر تو زندگی اور موت جیسی کیفیت تھے۔ ایسے اہم معاملات کے ہوتے ہوئے ایک تیرہ سال کی بچی کا بجلی سے ڈر، اس پر کون غور کرتا ہے؟

کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا، گرما گرم بحث ہو رہی تھی، ابا نے اسے دیکھتے ہی کہا:

"بھاگ کر سگریٹ لے آؤ۔۔" ابا نے دس کا نوٹ بغیر اس کی طرف دیکھے اسے

تھماتے ہوئے کہا تھا۔۔

"ابا۔" ۔اس نے کہنا چاہا۔۔

"جلدی واپس آنا۔۔" ابا نے سنے بغیر ہی کہا۔۔بحث دوبارہ شروع ہوگئی تھی۔۔"

بھٹو نے اسلامی ملکوں کو اکٹھا کیا۔۔ابا کے ایک دوست نے کہنا شروع کیا۔۔۔

"اسلامی ملکوں کو چھوڑیں جی غریب کو روٹی، کپڑا اور مکان دے دیتا، تو لوگ اس کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے۔۔۔ایک تیز آواز نے پہلی آواز کو کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔۔

" کسی ڈکٹیٹر میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ عوام کی طاقت کو کچل سکے لیکن جب آپ عوام کو ہی کچل چکے ہوں۔۔۔۔۔"

وہ اس بحث کو، جسے کرتے ہوئے سب کے چہرے خوفناک ہوئے ہوئے تھے، کاٹ کے ابا کو اپنے ڈر کا، بارش کا اور بجلی کا بتاتی تو ابا نے اس کی جان ہی نکال دینی تھی، بادل تو دور تھے اور شائد مہربان بھی ہوں مگر ابا کے بارے اسے کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ وہ قریب بھی تھے اور مہربان بھی نہیں تھے۔ اس لئے وہ ایک ہاتھ میں دس کا نوٹ اور دوسرے میں گڈا دبائے، ابا اور اس کے دوستوں کی آوازوں سے دور نکل آئی۔

ابا ایسے ہی تھے ہمیشہ دوسروں کے بچوں کو پیار کرتے اپنے بچوں کو دیکھتے ہی ان کے ماتھے پر سلوٹیں بڑھ جاتی تھیں۔مگر جب سے بڑے بھائی جان کا قد ان سے اونچا ہو گیا تھا، ابا ان سے کترا کر نکل جاتے اور بڑی بہنیں جب سے سکول چھوڑ کر گھر کی چار دیوار ی میں بیٹھی تھیں اور ان کے اندر اماں والا ابا کو بہلانے پھسلانے والا انداز اتر آیا تھا اور چھوٹے دونوں ہر وقت رونے میں مصروف رہتے تھے تب سے ابا کچھ بدل گئے تھے، شروع شروع میں تھوڑا سا سٹپٹائے پھر سنبھل گئے مگر اس سب تغیر کے نتیجے میں ساری توپوں کا رخ بشری کی طرف ہو گیا تھا اور وہ اتنی طاقتور نہ تھی کہ سارا بوجھ اٹھا سکتی مگر اس کے

علاوہ اس کے پاس چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔

ابھی اس نے آدھا ہی راستہ طے کیا کہ اسے خیال آیا کہ ابا نے اسے باہر سے ہی بھیج دیا تھا اور اسے اماں یا کسی دوسرے بہن بھائی کو بتا کر آنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ابا نے جب اسے بیٹھک سے آواز دی تھی تو وہ چھوٹے بھائی کو سنبھال رہی تھی۔ جو ماں نے یہ کہہ کر اسے پکڑایا تھا کے "اسے اپنے ساتھ کھلا، اگر یہ کچن میں میرے پاس آیا تو تجھے مار پڑے گی"

اور اماں کی مار سے بچنے کے لئے وہ اس پانچ سال کے شیطان کے ہاتھوں پٹ رہی تھی، جو غصے میں کبھی اس کے بال کھینچتا اور کبھی پیار سے اس کے چہرے پر اپنے ناخن مارتا۔ وہ پانچ سال کا تھا اور اسے بشری کہنے کی بجائے بُجھی کہتا تھا، اور اس کی دیکھا دیکھی باقی سب بھی اسے اسی نام سے پکارنے لگ گئے تھے۔اور وہ اس نام سے بہت چڑتی تھی۔ جتنا وہ چڑتی اتنا ہی اس کا زیادہ مذاق بنتا، بھائی جان بھی اسے چھیڑتے اور بہنیں اس کا درد سمجھنے کی بجائے، منہ میں دوپٹہ دبا کر ہنستیں جس سے اس کی تکلیف کئی گُنا اور بڑھ جاتی تھی اور ان کی ہنسی بھائی کو اور شہ دیتی تھی اور وہ سوچتی تھی کہ پتہ نہیں یہ بہنیں ہیں یا دشمن اسی طرح مولوی صاحب جب سورہ یوسف کا ترجمہ پڑھا رہے تھے تب بھی اس نے سوچا تھا یہ بھائی ہیں کہ دشمن۔۔۔

بشری کا ساتھ کوئی نہ دیتا تھا، اماں ہر وقت گھر کے لئے، یا اپنے رشتے داروں کے لئے یا ابا کے دوستوں کے لئے کھانا پکانے میں لگی رہتی تھی۔ ہاں، مگر جیسے ہی ابا کے رشتے دار آتے اماں کا چولہا ٹھنڈا پڑ جاتا۔۔کبھی گھر میں کچھ ختم ہو جاتا اور کبھی کچھ۔۔مگر ایسے وقت میں اُس کی بہت اہمیت بن جاتی تھی، اماں اس کو کہتی" جا ذرا اپنے ابا اور پھپھو کی باتیں سن کر آ، مگر دیکھ ظاہر نہ ہو کہ تو باتیں سن رہی ہے۔" اس وقت وہ اہم ہو جاتی۔اور گھر میں واحد

اماں ہی تھی جس سے وہ انتقام لے سکتی تھی۔۔اس مختصر وقت کے لئے اماں کو اپنے رحم و کرم پر محسوس کر کے اس کی گردن کندھوں سے اٹھ جاتی اور اسے خود فیصلہ کرنے کی عیاشی نصیب ہو جاتی تھی۔جیسے کہ اگر اسے اماں پر پیار آ رہا ہوتا تو کوئی بری بات نہ بتاتی،اس عمر تک اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کون کس بات سے خوش ہوتا ہے اور کون کس بات سے ناراض ہوتا ہے۔بڑوں اور بچوں کی اندر کی دنیاؤں سے اسے یکساں آگاہی ہو چکی تھی اور جب اسے اماں پر غصہ ہوتا تو وہ ابا اور پھپھو کی باتوں میں خوب نمک مرچ چھڑک دیتی تھی اور پھر اماں کو غصے میں پھنکتے دیکھ کر اسے بڑی تسلی ہوتی۔

ایک دفعہ جب اس کے چچا آئے تو اماں نے حسبِ عادت اسے جاسوسی کے لئے بھیجا۔مگر اسے اماں پر ایک روز پہلے کا بڑا غصہ تھا،جب اس نے ایک آم کھانے کے بعد اماں سے دوسرا مانگا تھا،تو اماں نے آم دینے کی بجائے اسے خوب باتیں سنائی تھیں:

"اوروں نے بھی کھانے ہوتے ہیں،لڑکیاں اتنا نہیں کھاتیں اور پھر بڑی کو گھورتے ہوئے کہا تھا ویسے بھی لڑکیوں کو کھلایا پلایا ضائع جاتا ہے۔۔مردود سب کچھ اگلے گھروں میں اٹھا لے جاتی ہیں۔جن کی نسلیں چلانی ہیں ان کا کھائیں جا کر۔۔"

"اماں۔۔۔"بڑی ایک دم چیخی تھی۔۔

"نہ تمھیں تھوڑی کہہ رہی ہوں،تم دونوں تو کم کھاتی ہو،یہ کم بخت بھائیوں کے مقابلے میں کھانے کو مانگتی ہے۔۔اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں" اماں نے بڑے بھائی جان کے لئے چار آم نکال کے ایک پلیٹ کے نیچے ڈھانپ کر رکھتے ہوئے کہا اور آم کی میٹھی گٹھلی چوستے چوستے اس کے حلق میں نمک اتر گیا گیا تھا اور اگلے ہی دن اللہ نے اسے موقعہ دے دیا کہ وہی نمک اماں کی آنکھوں میں اتار دے،جب اس نے اماں کو آ کر ابا اور چچا کے درمیان ہونے والی باتوں کی غلط سلط رپورٹ دی تو اسے اماں کو روتے دیکھ کر بڑا

مزہ آیا تھا۔

بارش اور تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس نے ہر چیز کو دھندلا دیا تھا حتی کہ اب دکانوں کے باہر لگے سائن بورڈ بھی نہیں پڑھے جا رہے تھے۔محلے کی سب دکانیں بند پڑی تھیں، آسمان پر بادلوں کی کڑک،اندھیرا اور اس کو چیرتی کبھی کبھی تیز بجلی۔اس کی جان نکلی پڑی تھی مگر سگریٹ کے بغیر گھر گئی تو ابا بہت مارے گا،اس لئے اس نے ڈر کے باوجود مین بازار جانے تک کا ارادہ کر لیا،اور اگر وہاں والی دکان بھی بند ملی تو مار کھانی پڑے گی۔مار کے تصور سے ہی وہ کانپ گئی اور کسی چست و چالاک بلی کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی بھاگنے لگی۔دس کا نوٹ بھیگ کر اس کے ہاتھ میں گھل رہا تھا،ہائے!اب تو دکاندار بھی ڈانٹے گا۔

ڈانٹے گا یا اس کے گالوں کو ہاتھ لگائے گا۔وہ دکاندار ایسا ہی تھا جب کوئی گاہک کھڑا ہوتا تو اسے ڈانٹتا تھا اور جب دکان خالی ہوتی تو اس کے گال چھونے کی کوشش کرتا اور اسے کہتا تھا اندر آ جاؤ ٹافی دوں گا۔۔اسے ٹافی اچھی لگتی تھی مگر وہ کبھی اندر نہ جاتی کیونکہ اسے اس کے ٹیڑھے میڑھے دانتوں،لٹکتی زبان،موٹے موٹے ہونٹوں اور لال پیلی آنکھوں سے نفرت تھی۔

"اللہ کرے اس بدمعاش کی ہی دکان کھلی ہو اور وہاں گاہک بھی ہوں تاکہ وہ اس کے گال نوچنے کی بجائے اسے دس کے گیلے نوٹ پر خوب ڈانٹے۔" مگر ابا کا خوف ان سب باتوں پر حاوی تھا۔

"سونیو!! سائیکل پر آ جاؤ۔۔"اس کے بالکل قریب سے ہی ایک مخصوص انداز والی آواز ابھری تو وہ بے ساختہ زمین سے فٹ بھر اوپر اچھل گئی۔۔۔جب سے وہ تیرھویں سال میں چڑھی تھی یہ مخصوص آوازیں اس کی زندگی کا حصہ بن گئیں تھیں اور وہ انہیں خوب پہچانتی تھی۔میٹھی میٹھی ذومعنی آوازیں،جو اسے سر سے پاؤں تک گھورتی تھیں ۔۔

اس سال سے اس کی زندگی میں یہ ایک بہت بڑا المیہ بن گیا تھا کہ بشریٰ، جو گھر میں باقی افراد کی نظروں میں آنے کے لئے کیا کیا تدبیریں اور کرتب نہ کرتی تھی اور پھر بھی توجہ کے قابل نہ تھی بلکہ ایک ان دیکھی مخلوق تھی مگر وہی بشریٰ باہر جی بھر کر، بڑے ذوق و شوق سے دیکھی جانے لگی تھی اور وہاں وہ سب سے چھپنا چاہتی تھی۔ باہر کی میٹھی آوازیں اسے گھر میں پڑنے والی گالیوں سے زیادہ زہریلی لگتی تھیں۔۔ مگر اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ جو وہ چاہتی تھی، اس کی زندگی میں سب الٹا ہوتا تھا۔

تیز بارش، اوپر سے تاریک اور سنسان گلی، ایسے میں یہ میٹھی آواز اس کے جسم میں ڈنگ کی طرح لگی۔ اس نے مڑ کر دیکھے بغیر اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا اور پھر اچانک پیچھے سے چھپڑاپ کی آواز آئی مڑ کر دیکھا تو وہی سائیکل سوار گلی میں بارش کے پانی کی وجہ سے نظر نہ آنے والے کھڈے میں گر پڑا تھا۔ گندے آدمی کو کیچڑ میں گرے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو رکی، بچوں کی طرح اچھل اچھل کر تالی بجائی، اس کا منہ چڑایا اور دوسرے ہی لمحے عورتوں کی طرح اپنا جسم سمیٹ کر بھاگ گئی۔

شکر ہوا کہ اس بدمعاش کی دکان کھلی تھی اور مزید شکر کہ محلے کی اس واحد کھلی دکان کے سامنے اکا دکا گاہک بھی چھاتا تانے کھڑے تھے۔

اسی لئے جب اس نے سگریٹ طلب کرتے ہوئے دس کا نوٹ دکاندار کی طرف بڑھایا تو حسبِ توقع اس نے بشریٰ کو خوب ڈانٹا۔۔

" کل نیا نوٹ لے کر آنا۔ پھر گاہکوں کو دیکھتے ہوئے بولا :" بچی ہے بچاری، اور بے بسی سے اس کے بھیگے جسم کو گھورا" اتنی بارش میں بھیگتی ہوئی آئی ہے اس لئے سگریٹ دے رہا ہوں، مجھے یہ بھی نہیں پتہ کہ کل کو اس کا باپ پیسے دے گا بھی یا صرف یہ کہہ دے گا کہ میں نے تو پیسے دے کر بھیجا تھا مگر کیا کروں میری طبیعت میں جو رحم دلی ہے

یہی مجھے مرواتی ہے۔"

"ایک پلاسٹک کا بیگ دے دیں۔۔" بشریٰ نے رحم دلی کا لفظ سنتے ہی فرمائش کر ڈالی۔

" کیوں؟ یہ بھی مفت میں دے دوں۔۔؟ دوکاندار نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

" بیٹی ایسی طوفانی رات میں لڑکیاں گھر سے نہیں نکلتیں۔ گھر میں کوئی آدمی نہیں تھا؟ ایک بزرگ نے اسے شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی بچی کی سفارش بھی کر ڈالی: ۔چل منظورے دے دے بیگ بچی کو"۔

اور بیگ دیتے وقت دکاندار نے اس کا ہاتھ گاہکوں کی نظر بچا کر اچھی طرح دبایا اور اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو کیونکہ " گیلی سگریٹ لے کر جاتی تو ابا گلا دبا دیتا اور اس منظورے کتے نے تو پھر بھی صرف ہاتھ ہی دبایا تھا۔۔" اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی اور گھر کی طرف تیزی سے بھاگنے لگی اور ساتھ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی رہی کہ کوئی آواز، کوئی ہاتھ تو اسے دبوچنے نہیں آ رہا۔۔

بارش پوری گھن گرج کے ساتھ برستی جا رہی تھی۔۔ گھر کا دروازہ نظر آتے ہی اس کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی، اب تک اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ دوڑتی ہی جائے گی اور گھر کا دروازہ کبھی نہیں آئے گا۔

" کتنا اچھا ہے میرا گھر" اس نے خوشی سے سوچا۔۔" اس کے اندر نہ بارش، نہ بجلی کی چمک، نہ بادل کی کڑک، نہ کوئی اجنبی آواز، نہ گندا ہاتھ"۔۔

اس نے بیٹھک کا دروازہ کھولا، دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی وہاں بیٹھے کسی آدمی نے میز سے سر نہ اٹھایا۔۔ سب بھٹو اور ضیاالحق سے نکل کر اب تاش کے پتوں میں گم تھے، اس

نے خامشی سے سگریٹ کی ڈبیہ میز پر رکھ دی، پھر بھی کسی نے آنکھ اٹھا کر اس کو نہ دیکھا جیسے وہ آئی ہی نہ ہو۔۔

وہ جس طرح خاموشی سے اندر آئی تھی اسی طرح باہر نکل گئی اور گھر کے اندر داخل ہوئی تو کچن سے، شوں کی آواز کانوں میں اور خوشبو اس کے نتھنوں میں گھس گئی "اوہ تو اماں دال کو تڑکا لگا رہی ہے"۔ اس کی بھوک جو خوف سے دب گئی تھی ایک دم معدے میں گڑگڑاہٹ کرنے لگی۔۔اور وہ اسی طرح کپڑے بدلے بغیر اماں کے پاس باورچی خانے میں آ گئی؛

"اماں بہت بھوک لگی ہے۔۔" وہ اماں کے پاس آ کر بولی

"ہائے ہائے۔۔جیسے ہی اماں کی نظر اس کے بھیگے جسم پر پڑی، وہ چلا اٹھی۔" کچھ شرم کر۔۔ساری ننگی ہو رہی ہے، کہاں گئی تھی؟ تجھے کچھ ہوش ہے کم بخت جوان ہو رہی ہے جوان، اپنی بہنوں سے کچھ سیکھ، کیا کروں میں تیرا۔۔اماں نے اسے اندر کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔۔جا جا کر کپڑے بدل، جوان بھائی گھر میں ہے، باپ ہے۔۔ہائے ہائے۔۔کیا کروں میں تیرا۔۔؟

"ابا نے سگریٹ لینے بھیجا تھا"۔۔وہ بکری کی طرح منمنائی، مگر اماں نے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔۔"دفعہ ہو جا ایک منٹ سے پہلے اندر جا کے کپڑے بدل۔۔۔۔"

وہ اماں کی ڈانٹ سے سہم کر کمرے کی طرف بھاگی، بھاگتے بھاگتے اس نے جوان بھائی کو دیکھا،، جو برآمدے میں چارپائی پر اوندھا لیٹا گانے سن رہا تھا۔آجکل وہ ہر وقت گانے سنتا رہتا تھا۔جب اٹھتا تو سامنے والی باجی شگفتہ کو چھت پر جا کر پہروں دیکھا کرتا اور اس وقت باجی شگفتہ کے کپڑے ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے ایسے لگتا کہ وہ یونہی تمام عمر کپڑے سوکھنے کے لئے تار پر پھیلاتی رہیں گی اور بھائی جان انہیں ایسے ہی

دیکھتے رہیں گے، اسے وہ دونوں کتنے خوش قسمت لگتے تھے جن کے پاس کرنے کا بس یہی ایک کام تھا۔۔

باجی شگفتہ نیچے چلی جاتی تو بھائی جان دوبارہ آ کر وہیں اسی برآمدے والی چارپائی پر الٹے لیٹ جاتے اور انہیں کوئی بھی نہ اٹھاتا تھا حتی کہ اماں ابا بھی پاس سے بس کترا کے گذر جاتے تھے۔ایک آدھ دفعہ بھائی نے شگفتہ باجی کو دینے کے لئے لفافے بھی دیئے تھے اور اس بات کو دوسروں سے چھپانے کے لئے اسے ٹافیاں بھی دی تھیں۔ٹافیوں سے زیادہ اسے بھائی جان کی نظر میں اپنی اہمیت دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔اور وہ چاہتی تھی کہ وہ یونہی ان کے لفافے باجی شگفتہ تک پہنچاتی رہی، اس کام سے پہلے اور بعد میں وہ بشریٰ کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔

انہی خیالوں میں مگن وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ یکا یک اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔۔ایک، دو، تین تھپڑ اس کے سر، گردن اور کمر پر پڑے۔

"ابا۔۔۔۔تھپڑوں کی تکلیف میں بھی وہ اپنے ابا کے ہاتھ کو پہچان گئی تھی۔۔۔

" مگر کیوں۔؟ اس نے مڑ کر بے بس ہرنی کی طرح ابا کو دیکھا اور ابا کو اتنے غصے میں بپھرے کھڑے دیکھ کر اس کی جان نکل گئی۔مگر ابا اسے کیوں مار رہے ہیں؟ اس نے تو طوفانی بارش میں، اندھیرے میں راستہ بناتے ہوئے، بجلی کی کڑک میں سے گذر کر ابا کو سگریٹ گیلے کئے بغیر لا دیئے تھے۔۔پھر کیوں؟

کیوں کا سوال اس کی زبان سے تو نہ نکل سکا مگر آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ تیرنے لگا، ابا کے تھپڑ تو رک گئے تھے مگر گالیوں کا سلسلہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا، اماں ایسی گندی گالیاں سن کے باورچی خانے سے بھاگی بھاگی ان کی طرف لپکی:

"ہے ہے کیوں مار رہے ہو؟ کیا ہوا۔؟ اماں کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

بڑی بہنیں ابا کی ایسی حالت دیکھ کر دور ہی سمٹی کھڑی تھیں اور بھائی جان ابا کے پیچھے یوں کھڑے تھے جیسے ان کی جگہ ہمیشہ سے وہیں پر ہو۔

"مجھے شروع سے ہی اس لڑکی کے لچھن ٹھیک نہیں لگتے تھے، ابھی پر پرزے نکلے نہیں مگر یہ ابھی سے ہمارے چہروں پر کالک پوت دے گی؟"

"ہوا کیا۔؟۔اماں چلائی ابھی تو تم نے خود ہی سگریٹ لینے بھیجا تھا، کیا تم نے نہیں بھیجا تھا، مجھے تو یہی بتا رہی تھی "۔اماں نے جلدی جلدی قیاسے لگانے شروع کئے۔

"اب کی بات کون کر رہا ہے"۔۔ابا دھاڑے

"اس حرافہ سے پوچھو کل یہ کس کے ساتھ سائیکل پر گھوم رہی تھی۔"۔

اتنا سخت لفظ ابا کے منہ سے سنتے ہی سب پتھرا گئے، دونوں بہنیں اور سمٹ گئیں، بھائی ابا کے اور ساتھ آ کر جڑ گیا۔اماں دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔۔۔

"پوچھو اس نامراد سے۔۔۔ابا بادل کی طرح گرج رہے تھے۔طوفان جو تھوڑی دیر پہلے وہ گھر سے باہر چھوڑ آئی تھی اب گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا۔گھر کی چھت اور دیواریں سب اڑ گئی تھیں۔آوازیں، ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔بھائی غصے سے بے قابو ہو گیا، اس کی غیرت ابلنے لگی اور اس نے بھی بشریٰ کے منہ پر زوردار تھپڑ دے مارا:

" تجھے ہم بے غیرت لگتے ہیں؟ اور پھر اماں کی طرف منہ کر کے چیخا۔۔" اماں سب قصور تمھارا ہے، اسے کہو چادر اوڑھا کرے، کھلے جسم دندناتی پھرتی ہے، تم اسے بچہ سمجھتی ہو، تیرے ہاتھ میں بچہ لا کر پکڑا دے گی اگر تو ایسی ہی معصوم بنی ہانڈی میں بس چمچہ ہلاتی رہی"

اور اماں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔۔۔۔ہائے حرام خور کس کے ساتھ گئی تھی؟۔۔"

"میں کسی کے ساتھ، کہیں نہیں گئی۔۔۔کہیں نہیں گئی اس نے ہچکیوں میں بات کہنے

کی کوشش کی مگر الفاظ بھی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

"بھولی نہ بن، میرا سیانا بیانا دوست جھوٹ بولتا ہے؟ کل تو گھر سے نکل کر پچھلی گلی کے شہزاد کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر نہیں گئی؟۔۔" ابا نے جواب آنے سے پہلے بات کرتے کرتے اس کا گلا اتنی زور سے دبایا کہ اس کی آنکھیں باہر ابل آئیں اور وہ درد کی شدت سے چلائی۔۔

"ابا میں کسی کے ساتھ نہیں گئی۔جھوٹ ہے ابا۔۔"

"جھوٹ سناتی ہے۔۔ابا ایک دفعہ پھر اسے مارنے کو دوڑے کہ ایکدم آپی بول پڑی۔۔" ابا یہ سچ کہتی ہے کل تو یہ سارا دن گھر پر ہی تھی کیونکہ اس کی سہیلی سلمیٰ آئی ہوئی تھی اور یہ دونوں سارا دن کھیلتی رہی تھیں۔

ابا وہیں تھم گئے "، تو سچ کہتی ہے، اس حرافہ کو بچا تو نہیں رہی؟ بڑی آپی نے زور زور سے ہاں میں سر ہلا دیا، پھر چھوٹی آپی کو بھی جیسے کچھ یاد آ گیا ہو:

"ہاں ہاں ابا یہ سچ کہتی ہے"۔

دو آدھی آدھی گواہیاں مل کے ایک پوری گواہی بن چکی تھی اب ابا کے پاس ان کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔۔" پہلے کیوں نہیں بک رہی تھیں، چلو بیٹھک میں ابھی بھی میرے دوست بیٹھے ہیں، چائے بنا کر بھیج دو ایک تو اولاد جوان ہو جائے تو بس ان کے مسئلے ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔۔ "۔ابا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور بیٹھک کی طرف چل دیئے۔بھائی نے بھی نظریں دوسری طرف کر لیں، بہنوں نے بشریٰ کو ایسے دیکھا جیسے اس احسان کا بدلہ وہ لے کر چھوڑیں گی اور اماں، ابا کے لئے چائے بنانے چلی گئی اور بشریٰ اپنے آپ کو خود ہی سنبھالنے لگی، وہ اپنے بے گناہ بچ جانے پر ذرا بھی خوش نہیں تھی۔ ذلت کا احساس اور تھپڑوں کی درد لگتا تھا وہ تمام عمر نہیں بھول پائے گی اور اب اسے ابا کی غلط

فہمی کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی ہوا یوں تھا کہ اس کی دوست سلمیٰ اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھی ،وہ ہمیشہ اپنے بھائی کے ساتھ ہی کہیں آتی جاتی تھی ، اسے گھر سے اکیلے نکلنے کی اجازت نہیں تھی ،اور وہ بشریٰ پر رشک کرتی رہتی تھی کہ وہ کیسے بازاروں میں گھومتی رہتی ہے،کل وہ اس کے گھر اپنی گڑیا کی شادی کرنے آئی تھی ۔سلمیٰ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس کے پاس بہت کھلونے اور پیسے ہوتے تھے ۔سلمیٰ کے بھائی نے جب اسے بشریٰ کے گھر اتارا تھا تو ٹھیک دس منٹ بعد وہ بشریٰ کے حوالے اپنی گڑیا اور اس کا جہیز کر کے بولی تھی کہ وہ گھر سے اور جہیز لے آئے اور یہ گڑیا بشریٰ کے گڈے کے ساتھ بیاہے جانے کے بعد جہیز سمیت اس کی ہی ہو جائے گی ۔ بشریٰ خوبصورت گڑیا اور بے تحاشا جہیز کے سحر میں اس طرح جکڑی گئی تھی کہ اسے یہ ہوش ہی نہیں رہا کہ سلمیٰ اکیلے کیسے گھر جا سکتی ہے یا دس منٹ کا کہنے کے بعد ایک گھنٹے بعد تک بھی نہیں آئی تو کہاں گئی ہو گی ۔وہ تو بس بہت لگاؤ سے اپنے گڈے کا گھر نئے نئے سامان کے ساتھ سجاتی رہی تھی ۔۔اور جب سلمیٰ واپس آئی تو اس کے پاس کوئی اور جہیز نہیں تھا بلکہ جب تھوڑی دیر بعد ہی اس کا بھائی اسے واپس لینے آیا تھا تو جاتے جاتے وہ اپنی گڑیا اور جہیز بھی ساتھ لے گئی تھی ۔اور جب بشریٰ نے اس سے وعدہ خلافی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا تھا" مجھے لگتا ہے میری گڑیا تمھارے گڈے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی ،اس لئے یہ شادی نہیں ہو سکتی"۔

اور بشریٰ رات بھر اس دھوکے کے دکھ میں ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں پائی تھی ۔

اب اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ کیوں اس کے گھر سے نکلی اس گلی کے ٹپورے شہزاد کے لئے اور اسے گھر سے نکلتے دیکھ کے ابا کے دوست نے اسے "میں" سمجھا ہو گا ،سلمیٰ تجھے اللہ پوچھے ،گڑیا بھی لے گئی ،جہیز بھی اور تیری وجہ سے مجھے اتنی مار پڑی ۔۔۔"

پہلی دفعہ زندگی میں اسے اپنی بہنیں بہت اچھی لگیں اس کا دل کیا جا کر ان کا منہ

چوم لے ،مگر وہ دونوں اسے دیکھے بغیر آپس میں باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں ، وہ ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہہ کر ہنس رہی تھیں جس میں وہ یقیناً مداخلت نہیں کر سکتی تھی ۔اس نے دل میں ہی بہنوں کا شکریہ کہہ دیا اور اسی لمحے اماں کی آواز آئی :

"ادھر باورچی خانے میں آ"

اماں چائے پیالوں میں انڈیل رہی تھی ،" یہ ٹرے میں رکھتی جا اور ابا کو بیٹھک میں دے آ ،اور سن بھاگا نہ کر ، دھمک کے ساتھ نہ چلا کر ، دھیرے سے بولا کر اور قہقہہ مار کے نہیں ہنستے ایسے ہی خوامخواہ تجھ پر شک جاتا ہے ۔۔ لے میری بچی" اماں نے کپ پکڑاتے ہوئے اس کا ماتھا چوم لیا ۔۔اور بشریٰ خاموش نظروں سے ماں کو دیکھتی رہی جو تھوڑی دیر پہلے اسے حرام خور کہہ رہی تھی اور ٹرے بیٹھک میں لے جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی :

اماں کو کیا پتہ باہر کتنا تیز بھاگنا پڑتا ہے ،اگر میں تیز نہ بھاگتی تو آج تیز طوفان میں سائیکل والے سے کیسے بچتی ؟۔۔

اماں کو کیا پتہ یہ تو سارا دن باورچی خانے میں بیٹھی رہتی ہے ۔۔

☆☆☆